باب پنجم

معارف کے شذرات و وفیات

① شذرات و وفیات کے مرتبین کا تعارفی خاکہ

۱- ادارت معارف کے چار ادوار ایک نظر میں

ادارت اول کا زمانہ	وسط 1916	تا	اواخر 1953	=	37½ برس	450 شمارے
ادارت دوم کا زمانہ	اوائل 1954	تا	اواخر 1974	=	21 برس	252 "
ادارت سوم کا زمانہ	اوائل 1975	تا	اواخر 1987	=	13 برس	156 "
ادارت چہارم کا زمانہ	اوائل 1988	تا	وسط 1999	=	11½ برس	138 "
کل معارف کی عمر	وسط 1916	تا	وسط 1999	=	83 برس	996 شمارے

۲- ادارت معارف کے مذکورہ بالا ادوار میں بحیثیت معاون مدیر یا بحیثیت قائم مقام مدیر کام کرنیوالے حضرات ایک

ادارت اول کے دوران

دو بار — مولانا عبدالماجد دریابادی — 8 ماہ 1920 میں + کچھ عرصہ 1943 کے بعد کے زمانے میں

ایک بار — سید ریاست علی ندوی — ایک برس 1947 میں

ایک بار عبوری طور پر — شاہ معین الدین احمد ندوی — ڈیڑھ دو برس کا عرصہ یعنی 1951 کے بعد سید صاحب کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے جبکہ مدیر کی حیثیت سے سید صاحب کا نام ہی رہا۔

ادارت سوم کے دوران — ایک بار — مولانا عبدالسلام قدوائی — ادارت سوم کے اوائل کا زمانہ تقریباً ۵ برس ۱۹۷۵ تا ۱۹۷۹

۳۔ مدیرانِ اربعہ کے نام

مدیر اول	سید سلیمان ندوی
مدیر دوم	شاہ معین الدین احمد ندوی
مدیر سوم	سید صباح الدین عبدالرحمن
مدیر چہارم	مولانا ضیاء الدین اصلاحی

۴۔ معاون مدیرانِ اربعہ کے نام

مولانا عبدالماجد دریابادی

سید ریاست علی ندوی

شاہ معین الدین احمد ندوی

ادارت اول کے زمانہ میں

مولانا عبدالسلام قدوائی — ادارت سوم کے دوران

۵- مدیرانِ معارف کے سرسری تعارف سے متعلق چند ضروری باتیں

مدیر اوّل

نام سید سلیمان ندوی

وطن موضع دیسنہ ضلع نالندہ صوبہ بہار

مدفن کراچی پاکستان مولانا شبیر احمد عثمانی کے پہلو میں

موت کی وجہ قدرتی موت

مدت حیات اواخر 1884 تا اواخر 1953

عمر 69 برس

مدت نظامت دارالمصنفین وادارت معارف 37½ برس

مدت ادارت میں معارف کے شماروں کی تعداد 450 شمارے

مدیر دوم

نام شاہ معین الدین احمد ندوی

وطن ردولی ضلع بارہ بنکی صوبہ اترپردیش

مدفن درگاہ قطب عالم شیخ احمد عبدالحق توشہ ردولوی ردولی شریف

موت کی وجہ قدرتی موت

مدت حیات 1903 تا اواخر 1974

عمر 72 برس

مدت نظامت دارالمصنفین وادارت معارف 21 برس قواعد و ضوابط کے مطابق

مدت ادارت میں معارف کے شماروں کی تعداد 252 شمارے

مدیر سوم

نام سید صباح الدین عبدالرحمن

وطن موضع دیسنہ ضلع نالندہ صوبہ بہار (سید صاحب کے عزیز اور ہم وطن)

مدفن قبرستان دارالمصنفین شبلی منزل

موت کی وجہ لکھنؤ میں سڑک کا حادثہ

مدت حیات 1911 تا اواخر 1987

عمر 76 برس

مدت نظامت دارالمصنفین و ادارت معارف 13 برس
مدت ادارت میں معارف کے شماروں کی تعداد 156 شمارے

مدیر چہارم

نام ضیاء الدین اصلاحی

وطن موضع سہریا ضلع اعظم گڑھ

دور حیات بقید حیات و بحالت صحت

مدت نظامت دارالمصنفین و ادارت معارف اب تک ½11 برس

اب تک کے مدت ادارت میں معارف کے شماروں کی تعداد 138 شمارے

② معارف کی ادارتِ اوّل کے شذرات و وفیات

۱- شذراتِ سلیمانی کا جائزہ

جولائی 1916ء سے معارف سیدؒ صاحب کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا۔ شذرات دراصل معارف کا اداریہ یا ایڈیٹوریل ہے جس کو اپنے اسلوب تحریر کی بنا پر غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور عوام و خواص دونوں طبقوں سے حسن قبولیت کا شرف حاصل ہوا۔ تقریباً ۳۵ سال کے حالات حاضرہ اور ملکی و ملّی مسائل کا احاطہ سید صاحب کے قلم سے شذرات میں ملتا ہے۔ سید صاحب کے اسلوب تحریر کی بوقلمونی جس کسی کو دیکھنی ہے اس کے لئے معارف کے ان شذرات کا مطالعہ ازحد ضروری ہے۔ دراصل شذرات کے معنی سونے کے ٹکڑے یا ڈلے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ شذرات واقعی اسم با مسمّٰی ہیں۔ یہ مدیر معارف کے دل کے ٹکڑے ہیں جو صفحات معارف کے طول و عرض پر دور تک پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ انھوں نے معلوم نہیں کس کس طرح فکر و نظر، جذبات و احساسات، علم و فن اور ذہانت و معرفت کا سونا پگھلا دیا۔ انہیں کہیں دل کی دھڑکنیں ہیں، کہیں ان کے سینے کے اندر جو کچھ کسک سی رہی اور جس طرح غم منزل بنی رہی اس کا پرتو بھی ان میں دکھائی دیتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو قلم بند کرتے وقت ان کی انتہائی کوشش رہتی کہ کہیں سے انا کی بو نہ آئے۔ وہ اپنی تحریروں کو حتی الامکان نیش زنی سے آلودہ نہیں کرتے بلکہ ان کو شرافت و اخلاق کی خوشبوؤں سے مہکاتے ہوئے دیکھنا پسند کرتے تھے۔ البتہ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور اس کے رسول برحق حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی تحریر دیکھتے تو پھر اس کا جواب لکھنے میں ان کا قلم بے قابو ہو جاتا۔ پھر اس سے ایسی زہریلی تحریر نکل پڑتی کہ بقول ان کے سات سمندر کا پانی بھی اس کے زہر کو زائل نہیں کر سکتا تھا۔

عام طور سے ان کے شذرات ان کی تحریر کے ایجاز کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ معارف میں انھوں نے شذرات کے 1192 اور مضامین کے 1900 صفحات لکھے ہیں۔ ان میں قرآن مجید اور حدیث، تاریخ، فقہ، کلام، ادب اور شعر و شاعری سب پر مضامین ہیں۔ قرآنی علوم پر جب کوئی مضمون لکھتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے علم و فن کے شاہکار میں قرآن پاک کی آبشار بہہ رہی ہے۔ احادیث پر کوئی تحریر قلم بند کرتے تو معلوم ہوتا کہ اس شاہکار میں حدیث کے انوار

و نکات کے گل کترے دکھائی دے رہے ہیں - کلامی رنگ کی کوئی چیز لکھی تو ان کے خیالات
کے سوسن و یاسمن کھلتے نظر آتے - تاریخ کا کوئی موضوع اختیار کرتے تو تحقیق و تدقیق کے
سرو و شمشاد نظر افروز ہوتے - شعر و ادب پر کچھ لکھنے کی طرف مائل ہوتے تو نکتہ سنجی اور نکتہ وری
کے پھول بکھرے دکھائی دیتے - علما و مشاہیر کی موت پر نوحہ کرتے تو ان کی سوگواری اور غم ناکی کی
گھنگھور گھٹائیں چھائی دکھائی دیتیں - کسی کانفرنس کے لئے خطبہ لکھتے تو یہ ان کے فکر و نظر کا شاہکار
بن جاتا -

تقریباً ۳۵ برس تک مسلسل شذرات میں وہ اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے -
جوں جوں وقت گزرتا رہا ان کی اہمیت اور انفرادیت ثابت ہوتی رہی اور مختلف طبقہ ہائے فکر و نظر
سے تائید و سند قبولیت ملتی رہی - مختلف النوع وقتی مسائل اور کبھی کبھی مستقل معاملات پر
اظہار خیال فرماتے چنانچہ مسائل و مباحث کے تنوع کی حیثیت سے ان شذرات کو دائرۃ المعارف
یا INCYCLOPEDIA کی حیثیت حاصل ہوگئی - نتیجہ کے طور پر نہ صرف یہ کہ ان
کی مدد سے بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے لیکر پانچویں دہائی تک کے قومی و ملی تحریکوں،
مختلف خیالات و رجحانات اور دوسرے پیش آمدہ حالات و واقعات کی تاریخ مرتب کی
جا سکتی ہے بلکہ مصنف کے خیالات و آراء بھی بخوبی معلوم کئے جا سکتے ہیں - بلاشبہ شذرات
سلیمانی غور و فکر، خیالات کی صحت و پختگی اور اصابت رائے، ایجاز و اختصار اور بلاغت
کے لحاظ سے ادب و انشاء کا شاہکار ہیں - ان میں سید صاحب مسلمانوں کے مذہبی و ملی زندگی کے
اجزاء و عناصر پر بڑے حکیمانہ انداز میں اظہار خیال فرماتے، ان کی ترقی و تنزل اور بقا و استحکام
کا پورا فلسفہ بیان فرماتے - شستگی، متانت، شرافت شذرات کے اسلوب کے جوہر اصلی ہیں
اور اس پر جا بجا شوخی و ظرافت کی گل کاری اور حسن صناعت کی سحر طرازیاں جیسے خاتم سلیمانی
میں نگینہ —— بقول مولانا عبد الماجد دریا بادی —— سلیمان عالی جاہ کے حدود مملکت کا
جائزہ لینا ہر کس، ہم جیسوں، کم رسوں، کوتاہ نظروں کا کام نہیں - شذرات سلیمانی کی
ادبی رعنائی و ترو تازگی کا حال بھی مولانا عبد الماجد دریا بادی کے سحر طراز قلم سے ملاحظہ ہو:

" صاحب معارف کی شذرات نگاری ایک خصوصی و امتیازی شان نگارش رکھتی ہے - بے لاگ لیکن نہ درشت نہ تند
عمیق لیکن نہ ادق نہ معلق — رنگین لیکن نہ پرتکلف نہ ثقیل — سلیس لیکن نہ سطحی نہ عامیانہ — شگفتہ لیکن نہ ناولانہ نہ خطیبانہ -

جاندار لیکن نہ گرما گرم نہ پُر جوش ۔ صالح لیکن نہ خشک نہ مولویانہ ۔ سلیمانی ادب و انشاء کا اردو کی تاریخ ادب و انشاء میں جو ایک خاص مقام ہے اس کی اصل بنیاد ہی معارف کے ادارتی صفحات سے پڑی اور معارف کے شذرات نے بہتوں کے لئے ایک نئی راہ کھول دی" ۱؎

سید صاحب ایک بیدار ذہن کے ساتھ درد مند دل بھی رکھتے تھے اس لئے دنیا کے کسی بھی حصہ میں جب مسلمانوں کو تکلیف پہونچی تو وہ بے چین ہو جایا کرتے تھے ۔ شذرات معارف میں کہیں وہ مسلمانوں کی غفلت پر گریہ کناں ہیں ، کبھی نوجوانوں کی گمروی پر خون کے آنسو بہاتے نظر آتے ہیں ، کبھی عظمت رفتہ کو یاد کرتے ہیں اور کبھی ان کی ذہنی پسماندگی پر تنبہ کرتے ہیں اور ایک ضرب کلیمی لگاکر ان میں خود شناسی اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں ۔ کبھی لسانی تعصب و تنگ نظری پر حکومت وقت کے سامنے سینہ سپر نظر آتے ہیں ۔ کبھی مسائل نسواں پر بصیرت افروز مشورے دیتے ہیں اور کبھی کسی عزیز دوست، ہمدم دیرینہ یا بزرگ قوم کی موت پر خون کے آنسو بہاتے اور دوسروں کو رلاتے ہیں ۔ سید صاحب نے شذرات میں ہر قسم کے اہم مسائل پر اظہار خیال کیا ہے ۔ ان میں ان کی ترقی و انحطاط اور بقا و استحکام کا پورا فلسفہ بیان کردیا ہے ۔ یہ شذرات صرف وقتی و عارضی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ان کی حیثیت مستقل درس کی ہے جن سے ہر زمانے میں استفادہ کیا جا سکتا ہے ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ادب و انشاء کے طالب علم اور صحافت و سیاست کے نو واردان شذرات معارف سے حسن بیان، متانت تحریر اور اصابت رائے کا سبق لیں ۔

۱؎ دیباچہ 'شذرات سلیمانی' حصہ اول ۱۹۹۰ از مولانا ضیاءالدین اصلاحی

اس مضمون کے آخر میں ہم شذرات سلیمانی سے براہ راست متعارف ہونے اور اس کی اہمیت کو ثابت کرنے کے لئے سید صاحب کے مکمل تحریر کے طور پر شذرات سلیمانی کے چند شاہکار سطور قلم بند کرتے ہیں :

— " دنیا بہر طاؤس کی خوش نمائی ، خوش منظری اور حسن و جمال کی مداحی میں رطب اللسان ہے لیکن خود طاؤس کی کیفیت اپنے پیروں پر نظر کرنے سے کیا ہوجاتی ہے ۔ بقول اردو کے ظریف ناظم

نہ بھول اس پہ کہ یہ اور وہ تجھے اچھا سمجھتا ہے
تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے " [2]

— " آپ آگ کے دھوئیں سے پریشان ہورہے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ گیلی لکڑیاں تو خود آپ ہی نے سلگا رکھی ہیں ۔ اگر بغیر اس آگ کو بجھائے آپ دھوئیں کو بند کردینا چاہتے ہیں تو آپ کا دماغ اس قابل ہے کہ اس کے ساتھ ہمدردی کی جائے ۔ " [3]

— " شتر مرغ آپ جانتے ہیں ایک عظیم الجثہ پرندہ ہے ۔ اس کی نسبت فارسی میں ایک قصہ ہے کہ جب ایک ایرانی شکاری نے اس کو پرندہ سمجھ کر شکار کرنا چاہا تو اس نے کہا کہ — میں تو شتر (اونٹ) ہوں ۔ اور جب اس کو اونٹ سمجھ کر اس نے اپنا اسباب اس پر لادنا چاہا تو اس نے معذرت کی کہ — میں تو مرغ ہوں 'اسباب لادنا' میرا کام نہیں بعینہ اسی طرح یورپ نے 'تاریخی افسانہ' کے نام سے ایک 'علمی شتر مرغ' تخلیق کیا ہے ۔ ناظرین کے سامنے اس کو پیش کیا جاتا ہے تو یقین دلایا جاتا ہے یا یقین پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ سرتا پا تاریخی ہے ۔ لیکن جب آپ اس پر تاریخی

---

[2] شذرات معارف جنوری ۱۹۲۲ء [3] شذرات معارف اپریل ۱۹۲۲ء

حیثیت سے اعتراض کریں گے کہ اس میں مندرج واقعات اصلیت سے خالی ہیں تو جواب یہ ہوگا کہ یہ تو افسانہ ہے، اس میں تاریخ سے تطبیق کی تلاش کیوں ہے؟" [4]

— "مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں جو چیز سب سے زیادہ حائل ہے وہ اطاعت کی کمیابی ہے اور اسی سے ہمارا تمام نظام درہم برہم ہے۔ حالانکہ ہم کو یہ حکم تھا کہ اپنے افسروں کی سنو اور اطاعت کرو۔ ولو کان عبداً حبشیا (اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو) دریا کو قطرہ قطرہ کردو تو دریا فنا ہو جائے گا۔ پھول کی ایک ایک پنکھڑی نوچ ڈالو تو گلدستہ نہ ہوگا۔ جانور تک اپنے گلے اور غول رکھتے ہیں پر حیف ہے انسان پر کہ اس کی کوئی جمعیت اور تنظیم نہ ہو۔" [5]

— "ہم نے کہا ہے اور پھر کہتے ہیں کہ مسلمان دم میں جل جانے والے اور جلا دینے والے کوہ آتش فشاں ہیں۔ لیکن ہمیشہ سلگنے والے اور جلتے رہنے والے آتش کدہ نہیں۔ وہ ایک لمحہ کے آنے والے اور گزر جانے والے طوفان آب ہیں لیکن ہمیشہ بہنے والے ہمالیہ کی برفستانی چوٹیوں کے چشمے نہیں۔" [6]

— "ہم ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہیں لیکن یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہ کر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہیں جس کی مثالیں انگریزوں کی دی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان میں بکثرت تھیں۔" [7]

نوٹ: ۱۹۲۷ء کے بعد سید صاحب معارف میں کوئی مستقل مضمون نہ لکھ سکے۔ وفیات کے عنوان سے کبھی کبھی لکھتے یا شذرات لکھ دیتے۔ جون ۱۹۵۰ء کے معارف میں ان کے آخری شذرات شائع ہوئے جن کا یہ آخری شذرہ ہے۔

---

[4] شذرات معارف اکتوبر ۱۹۲۳ء   [5] شذرات معارف ستمبر ۱۹۲۴ء

۲۔ شذراتِ سلیمانی کے چند اقتباسات

۱۔ "مسلمانوں کے اختلاف کے اسباب ــــ تجزیہ اور اس کا علاج

رائے اور تخیل کے لحاظ سے مسلمانوں کا جو عام حال ہے وہی ان کے قومی مظاہر کی صورت ہے۔ ان کی یونیورسٹی سے لیکر ان کے کالج اسکول مدرسہ اور مکتب تک اور اسمبلی سے لیکر کونسل ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی تک ہر جگہ اختلاف اور نفاق انگیزی اور ہنگامہ آرائی کی ایک صورت ہے۔ آخر آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے ــــ ہر قوم کی ترقی و تنزلی کا صرف ایک سبب ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی قوم کے تمام یا بیشتر افراد میں کسی ایک اعتقاد خیال اور مقصد کے لئے ایسی وحدت پیدا ہو جاتی ہے جو شیرازہ میں منتشر افراد کو جکڑ کر ایک دوسرے کو ملا کر اس طرح سے ایک کر دے کہ ان کا جینا اور مرنا اسی کے لئے ہو تو وہ قوم اپنے میں ناقابل تسخیر قوت پاتی ہے اور ہر بڑی مشکل کے پہاڑ کو سیلاب بن کر بہالے جاتی ہے اور ذاتی اغراض، مال کی حرص و طمع، نفسانی اور خاندانی عزت و آبرو کی خواہش وغیرہ ہر چیز اسی وحدت مقصد کی تیز آگ میں جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔" ۸

۲۔ "آج زبانوں پر تنظیم تنظیم کا نام ہے مگر تنظیم ہے کیا؟

معارف کو فخر ہے کہ سب سے پہلے آج سے چودہ برس پہلے (۱۹۱۷ء) اس نے لفظ تنظیم اور اس کا مفہوم سب کے سامنے پیش کیا تھا۔ لفظ تو سب نے قبول کر لیا مگر معنی کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ تنظیم نام حکومت یا کانگریس کی معیت، سول نافرمانی میں شرکت یا عدم شرکت، گول میز کانفرنس میں جانے یا نہ جانے، جمعیۃ العلماء یا توسیع نظام علماء میں شامل ہونے، خاص مسلمان یا عام مسلمان یا ہندوستانی پارچے خریدنے کا نہیں، یہ سب تو نتائج و مظاہر و فروع ہیں اور یہاں بحث اصل اور جڑ کی ہے ــــ تنظیم اور جمعیت کی حقیقت تمام قوم کے مقصد، غرض و غایت، خیال و نصب العین کی وحدت اور اتحاد یعنی تمام افراد کی باہمی کوشش، جدوجہد، دوڑ دھوپ خواہ کسی قدر متعدد، مختلف اور متضاد ہے لیکن سب ایک ہی غرض ایک ہی جہت اور ایک ہی مقصد کے لئے۔ بے شک یہ نہ ہو تو لفظ تنظیم بے معنی، کوشش بے سود، جدوجہد بے نتیجہ، سعی اور محنت بے کار ہے۔" ۹

۳۔ آج دنیا میں ہر طرف ترقی ترقی کی پکار ہے بلکہ انگریزی عہد کی ابتداء سے آج تک مسلمانوں کے مختلف حلقہ ہائے فکر میں اس صدائے بازگشت کی دھمک سنی جا رہی ہے لیکن اس لفظ ترقی کی تعبیر و تعیین میں

---

۸ شذرات معارف ستمبر ۱۹۳۰ء ۹ شذرات معارف اکتوبر ۱۹۳۰ء

اس قدر اختلاف ہے کہ آج تک اس کا صحیح مفہوم متعین نہیں ہو سکا۔ سید صاحب نہایت حکیمانہ انداز میں اور بصیرت افروز اسلوب میں ترقی کی حقیقت کی وضاحت فرماتے ہیں:

"آج دنیا میں ہر طرف ترقی ترقی کی پکار ہے، مسلمان بھی اسی کی رٹ لگا رہے ہیں۔ جہاں تک لفظ کا تعلق ہے کسی کو اس سے اختلاف نہیں لیکن جب اس کے معنی کی توضیح کی جاتی ہے تو دفعتاً ہر طرف سے ذہنی اختلافوں کا نظارہ شروع ہو جاتا ہے۔ کوئی صاحب اس سے یوروپین طرز تمدن اور طرز معاشرت مراد لیتے ہیں، کوئی فرقہ اس سے دولت و تمول کا مفہوم سمجھتا ہے۔ کوئی نئی تعلیم اور ڈگریوں کی کثرت کو اس کا مرادف جانتا ہے، کوئی سیاسی سرگرمیوں کو تنہا ترقی کہہ کر پکارتا ہے کوئی اس سے صنعت و حرفت و تجارت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کوئی پرانے خیال کا آدمی اس سے قرون اولیٰ جیسی اخلاقی و روحانی حالت و کیفیت کی تعبیر کرنا چاہتا ہے۔ اور بہت سے نوجوانوں کے نزدیک مستورات کی عریانی، ڈنر کے بعد محفل رقص و سرود کا نشاط اور یوروپین تہذیب کے دیگر معائب کے مجموعے کا نام ترقی ہے۔ غرض عمر شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ترقی صرف اس روح کا نام ہے جو قوموں کو زندہ کرکے ان کے رگ و ریشے میں جد و جہد اور سعی و عمل کی تڑپ پیدا کر دیتی ہے۔ وہ تمام قوم میں کسی متفقہ مقصد کے حصول کی خاطر ہر قسم کی تکلیف و مشقت کی برداشت کی قوت پیدا کر دیتی ہے۔ ترقی کسی خاص مادی منظر کا نام نہیں بلکہ یہ وہ تجلی ہے کہ جب کسی قوم کے افراد میں نمودار ہوتی ہے تو ہر ایک کے دست و بازو میں اپنے فرائض کے بجا لانے کی استعداد پیدا کر دیتی ہے اور پوری قوم اپنے افراد کی مختلف استعدادوں اور قوتوں کی مجموعی کوششوں سے زندگی اور عمل کے نئے قالب میں ڈھل جاتی ہے"۔ ملہ

۴۔ مذکورہ بالا موضوع و موقف کی وضاحت کے لئے سید صاحب مزید ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

"قوموں کی ترقی کا اصول ہمیشہ ایک رہا ہے، چند سچی حقیقتوں پر مستحکم یقین اور اس یقین کے مطابق عمل اور کامیابی کے لئے مسلسل جد و جہد و سعی و محنت اور اس راہ میں جو تکلیف و مصیبت پیش آئے اس کو ہنسی خوشی جھیل لینا۔ زمانہ کی اصطلاحیں بدلتی رہیں گی لیکن اصطلاحوں کے بدلنے سے حقیقتیں نہیں بدلا کرتیں۔ اسلام کی اصطلاح میں اس مستحکم یقین کا نام ایمان، اس کے مطابق عمل کا نام عمل صالح اور مسلسل جد و جہد اور سعی و محنت کا نام جہاد اور اس کے لئے پامردی کا نام صبر و ثبات ہے۔ دنیا میں جب کسی قوم کو کامیابی ہوئی ہے تو اس اصول کے مطابق ہوئی ہے اور جب آئندہ ہوگی تو اسی اصول کے مطابق ہوگی۔

ملہ شذرات معارف، ۱ر ۱۹۳۴۳ء

جانی و مالی ایثار و قربانی اس جد و جہد کی لازمی حقیقتیں ہیں جن کو قرآن پاک کی اصطلاح میں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کہتے ہیں۔ دنیا کی کوئی تحریک اس مالی و جانی جہاد کے بغیر کامیاب ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ مذہبی تحریکوں کو جانے دیجئے آج سیاسی و اقتصادی تحریکوں کا دور ہے، ان میں سے کون سی تحریک کی گاڑی ان دو پہیوں کے بغیر چل رہی ہے۔ روس کا انقلاب، جرمنی اور اٹلی کا فاشزم، اسپین کی جمہوریت و آمریت کا تصادم، فلسطین کی شہادت گاہ، ان میں کہاں ان دو کے بغیر کامیابی نصیب ہوئی ہے یا ہوگی۔ پھر ہندوستان کے علاوہ اس عرصۂ حیات میں کوئی انوکھی مخلوق بستی ہے کہ ان کے لئے دنیا کا اصول بدل جائے گا اور اللہ تعالیٰ ان کے لئے اپنے قانون قدرت کو توڑ دے گا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں اپنے قومی و سیاسی ایمان کے لئے کون سی حقیقتوں اور سچائیوں کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے اور اس کے حصول کے لئے وہ کون سی سرفروشی اور قربانی کر رہے ہیں۔

ہمارے سامنے اسلام خود ایک بہت بڑی حقیقت اور صداقت ہے۔ وہ مذہب بھی ہے سیاست بھی ہے، اقتصاد بھی ہے معاشرت بھی ہے۔ اس کے مذہبی و سیاسی و اقتصادی و اجتماعی پیغاموں کو پھیلانا، مساوات و عدل قائم کرنا، اسلامی احکام کی تبلیغ کرنا، دنیا سے سود، شراب خوری، قمار بازی اور ظلم کو بیخ و بن سے اکھاڑنا اور ملک میں ایک نیا سیاسی و اقتصادی نظام قائم کرنا، اس کے وہ فرائض ہیں جن سے مسلمان غافل ہیں اور غیر مسلم ان کے لئے آج دنیا میں کٹ مر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ جس کے لئے آج وہ کٹ رہے ہیں وہ دین اسلام ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں اسلامی نظام کی جھلک ہے۔ اب یہ خود ہمارا کام ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور اپنا مکمل سیاسی و اقتصادی نظام دنیا کے سامنے پیش کریں اور اس کے لئے ہم وہ جذبہ دکھائیں جو اسپین میں جمہوریت اور فاشزم کے حامی دکھا رہے ہیں۔ وہاں قومیں نہیں لڑ رہی ہیں بلکہ ایک ہی قوم کے دو حصے دو مختلف نظریوں کی خاطر جان و مال کی بازی لگا رہے ہیں

آج زمانہ بدل گیا ہے تو اصطلاحیں بدل گئی ہیں لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے۔ آج پھر اسلام کو اسی فرض کو ادا کرنا ہے۔ اگر آج کے کلمہ گو مسلمانوں میں ادائے فرض کے سپاہی بننے کا ولولہ نہیں ہے تو کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو زندگی کے میدان میں لائے اور اس سے اسلام کا یہ فرض ادا کرائے۔

آج دنیا اپنی نجات کی راہ فاشزم، نازی ازم، سوشلزم، کمیونزم اور بالشوزم میں ڈھونڈ رہی ہے حالانکہ اس کا ایک ہی راستہ ہے یعنی اسلام ازم۔ لیکن وہ اسلام نہیں جو آج عملاً مسلمانوں میں ہے بلکہ جو قرآن و سنت میں ہے۔ آج کی وہ کون سی مشکلیں ہیں جن کا حل اس میں نہیں ہے۔ ضرورت نئی نظر اور نئی قوت کی ہے"۔ [11]

---

[11] شذرات معارف جنوری ۱۹۳۹ء

۵ - سید صاحب کی ایک بڑی خصوصیت قدیم و جدید روشنی کی جامعیت تھی یعنی ایک ایسا مجمع البحرین جہاں دو مختلف سمتوں سے آنے والے دو متضاد رنگ اور رفتار کی دھاراتیں ایک جگہ مل کر اپنی زندگی کا آگے کا سفر طے کرتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کو ہر طبقہ میں قبول عام حاصل تھا - باوجودیکہ وہ قدیم تعلیم و ثقافت کے نمائندہ تھے لیکن ان کے دل و دماغ میں بے پناہ وسعت تھی - وہ پرانی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ جدید خیالات و رجحانات اور اس کے طور طریقوں سے پوری طرح واقف اور ہم آہنگ تھے - وہ ان سے بھڑکتے نہ تھے بلکہ ان کو صحیح راستہ پر لگانے کی کوشش کرتے تھے - اس لحاظ سے وہ قدیم و جدید کے سنگم تھے اور اپنی ذات کو ان دونوں طبقوں سے ایسا مانوس کر لیا تھا کہ کہیں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے اور دونوں اپنے اپنے حلقہ میں ان کے علم و فضل اور اصابت رائے سے فائدہ اٹھاتے تھے - قدیم و جدید کی چپقلش کے سلسلہ میں سید صاحب رقم طراز ہیں :

"قدیم و جدید کی جنگ دنیا میں ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن کبھی اس پر غور کیا ہے کہ قدیم و جدید دونوں حقیقی نہیں بلکہ اضافی نسبتوں سے ہیں - ہر قدیم اگلے کے لحاظ سے جدید اور ہر جدید آئندہ کے لحاظ سے قدیم ہے - عہد شاہجہانی کا طور طریق، تہذیب و تمدن، لباس و پوشاک اور طرز عمارت اپنے زمانہ میں کتنا پسندیدہ معیاری اور مقبول رہا ہوگا لیکن محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں وہی بھدا، نازیبا اور ناپسندیدہ ٹھہرا ہوگا - پھر ابتدائی انگریزی عہد میں انگریزی لباس کس قدر ہندوستانیوں کو ناپسندیدہ، غیر دلکش بلکہ بدنما اور بدتہذیبی اور بے شعوری کا مرقع نظر آتا ہوگا - بالآخر پچیس تیس برس میں وہ تہذیب و شرافت اور بڑی سوسائٹی کا نشان امتیاز اور طریق حصول اعزاز بن گیا - اب اگر عہد شاہجہانی کا کوئی وضع دار امیر اپنی پگڑی، جامہ اور گھیتلے جوتوں میں ہمارے سامنے آئے تو ہم اس کو کیا سمجھیں گے - اس لئے آج آپ جس کو جدید سمجھ کر خوش ہو رہے ہیں اور جس کو عقل و دانش، فضل و کمال اور تہذیب و تمدن کا معیار سمجھتے ہیں اس کی زندگی بھی کتنے دن کی ہے - پھر یہ جدید و قدیم کی جنگ بے معنی ہے - کسی چیز کے حسن و قبح کے پرکھنے میں ہم ہمیشہ دھوکہ کھاتے ہیں کہ پسند تو اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں اور اس قابل پسند ہونے کی اہلیت خود ان اشیاء میں یقین کرتے ہیں، حالانکہ حسن و قبح بالذات اشیاء میں نہیں ہے بلکہ خود ہماری آنکھوں میں ہے -

ظاہری لباس و وضع کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے - یہی حال اندرونی افکار و خیالات کا بھی ہے، وہ ہر عہد میں نئے اور ہر زمانہ میں متغیر ہوتے ہیں اور جس طرح ہر زمانہ میں جو لباس اور جو وضع مقبول ہو جاتی ہے اس کی مقبولیت کی دلیل عقلی نہیں ہوتی بلکہ سراسر زمانی ہوتی ہے، یعنی وہ حسن اشیاء میں نہیں بلکہ اس زمانہ

کے دیکھنے والے کی آنکھوں میں ہوتا ہے ۔ اسی طرح ہر زمانہ میں جو خیالات پھیل جاتے ہیں وہ لغوی ہونے کے باوجود بھی اس زمانہ میں بالکل بدیہی معلوم ہونے لگتے ہیں ۔ حالانکہ ان خیالات کی جدت ان کے عقلی زور اور ان کی پر حکمت ہونے کی شہادت نہیں ۔ اسی لئے کسی چیز کا جدید اور فنا ہونا کسی عہد میں رواج پذیر اور شائع ہونا کسی اندرونی خوبی کی قطعاً دلیل نہیں ۔

پھر کیا ابدی اور دائمی حقیقت کوئی چیز نہیں اور ہر چیز تغیرات زمانہ کے لحاظ سے فلسفی وجود سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اس کا جواب آپ کو ابھی مل جائے گا ۔ ان بیشمار تغیرات اور دم بدم بدل جانے والے اشکال و صور کے ساتھ ساتھ ایک دائمی حقیقت بھی ہمیشہ موجود ہے ۔ وضعیں بدلتی ہیں، شکلیں نئی بنتی ہیں، تراش و خراش بگڑتی اور بنتی ہے ۔ مگر ایک چیز ان تغیرات کے اندر ہمیشہ قائم ہے اور وہ سردی اور گرمی سے بچاؤ اور بعض اعضاء کی پوشش کا لحاظ ۔ یہی غیر متغیر اور غیر متبدل خیال لباس کی حقیقت ہے جو ہزار تغیرات کے باوجود قائم ہے اور یہی غیر متغیر حقیقت اہل نظر کی نگاہوں میں لحاظ کے قابل ہے ۔ اسی اصول کو باطنی خیالات و افکار کی حقیقت اسی کے کام میں لا سکتے ہیں ۔ حقیقت و فریب کے درمیان فرق کر سکتے ہیں، اور کتنے خوش نصیب ہیں وہ جو اس راستہ سے بازار کے فریب سے نکل کر حقیقت کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں ۔" [۱۲]

۶ - سید صاحب کے دور کے ہنگامی حالات کے تناظر میں جس میں معارف نے اپنا سفر حیات شروع کیا تھا اس عالم کے موضوع پر سید صاحب رقم طراز ہیں :

"گذشتہ جنگ جہاں سوز کے دوران جرمنی نے زہریلی گیس کا استعمال شروع کیا تھا، اس کی اس بربریت پر ساری مہذب و متمدن دنیا لرزہ بر اندام حیرت و غضب سے تھرا اٹھی تھی لیکن آج جبکہ ہنگامی اشتعال اور ضروریات جنگ میں کوئی شے موجود نہیں اور دنیا پر ایک بڑی مدت تک امن و امان کی فرمان روائی بھی جا سکتی ہے ۔ اس وقت یورپ میں پرسکون غور و فکر کے بعد امریکہ کی متمدن، صلح جو، آشتی پسند حکومت یہ فرمان نافذ کرتی ہے کہ فوج کو زہریلی گیس کے استعمال سے دست بردار ہونے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ آئندہ جنگ کے موقع پر ہر امریکی سپاہی کو اپنی اپنی جیب میں اس کی ایک ایک ڈبیہ رکھنا لازم ہوگی ۔ امریکہ کے ماہرین سائنس نے اس گیس کو منجمد بنا دیا ہے اس لئے اسے صابن کی طرح بآسانی ڈبیہ میں محفوظ رکھا جا سکتا ہے ۔

مسئلہ کے سیاسی پہلو سے یہاں واسطہ نہیں ۔ یہاں دکھانا صرف یہ مقصود ہے کہ یہ اس قوم کا طرز عمل ہے جو مغرب میں صلح و آشتی کی سب سے بڑی علم بردار مشہور ہے جس کے آئین اساسی

---

[۱۲] شذرات معارف مارچ ۱۹۳۲ء

میں یہ دفعہ بھی شامل ہے کہ اس قوم کو دوسروں کے لڑائی جھگڑے سے کوئی واسطہ نہ ہوگا اور جس کے رئیس حکومت (پریسیڈنٹ ولسن) کو ایک لاکھ کا گراں قدر نوبل پرائز اس بنا پر عطا ہوا ہے کہ انھوں نے قیام امن میں بہترین مساعی سے کام لیا -

دنیا کشت و خون کے مناظر سے اکتا گئی ہے - جنگ و جدل کے نام سے وہ لرزنے لگی ہے اور اس سے بچنے کے لئے ہر ممکن ذریعہ سے وسیلہ تلاش کر رہی ہے - لیکن کیا اس سعی میں کامیابی کی بھی صورتیں ہیں، کہ اقوام اپنی جنگی شقاوت و ذہنی سنگدلی کے لئے روز بروز تیاری کرتی رہیں - لیکن درحقیقت اس میں کسی مخصوص فرد یا قوم کا قصور نہیں بلکہ یہ صورت حال لازمی نتیجہ ہے اس نظام تمدن کا جس کی سیادت کا شرف یورپ و امریکہ کو حاصل ہے اور جو بالواسطہ اس وقت ساری دنیا پر حاوی و محیط ہے - جس ضابطۂ اخلاق میں انکسار و فروتنی، غیرت و قناعت کا کوئی درجہ نہ ہو، جس طرز معاشرت میں بلند ترین مرتبہ عالی حوصلگی و بلند نظری کو دیا گیا ہو، جس فلسفۂ سیاست میں فن احتیال و حکمت عملی کو فضائل و کمالات میں شمار کیا جاتا ہے اور جس نظام تمدن کی بنیاد تمام تر تنازع للبقاء، مسابقت و باہمی کشمکش پر ہو اس کے علم برداروں سے یہ توقع رکھنا کہ ان کی کوششیں مستقل و پائیدار امن و امان کو وجود میں لا سکیں گی گرگ سے گلہ بانی کی امید قائم کرنا ہے - سچ یہ ہے کہ جس وقت تک دنیا پر مادی تمدن اور خود پرستانہ جذبات کی حکومت قاہرہ قائم ہے مجالس صلح کا انعقاد، سیاسی صلح ناموں کی ترتیب، نوبل پرائز کے بیش قرار و حوصلہ افزا انعامات غرض ان کی ہر کوشش قطعاً لاحاصل و بے سود ہے"۔ [13]

---

[13] شذرات معارف ۱۹۲۱ء

۳- وفیات سلیمانی کا جائزہ

سید سلیمان ندوی نے معارف کے شذرات میں جہاں ایک طرف ملکی وملی مسائل پر اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کیا ہے وہاں دوسری طرف معاصر شخصیات کی وفات پر بھی اپنے گہرے قلبی و روحانی رنج وغم کا اظہار فرمایا ہے ۔ ان معاصر شخصیتوں میں عزیز و اقارب، احباب، بزرگ شخصیتیں، سیاستدان، اہل قلم وغیرہ ہر انداز اور طبقے کے لوگ ہیں ۔ چونکہ ان تاثرات کا تعلق قلب وروح کی عمیق گہرائیوں سے تھا اس لئے ان کی اہمیت اور افادیت بہت جلد ثابت ہوگئی اور ہر حلقہ میں بڑی قدرو منزلت اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے ۔ بعد میں دوستوں کے مشورے سے اور بعض مصالح کی بنا پر سید صاحب 'وفیات' کے عنوان کے تحت سوگنامے شائع کرنے لگے ۔ یہ سلسلہ بھی قارئین کے حق میں نافع ثابت ہوا اور اہل علم نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور پسندیدگی کا اظہار کیا ۔ یہاں تک کہ سید صاحب کے وفیات پر مشتمل پہلا مشہور مجموعہ 'یاد رفتگاں' کے نام سے ۱۹۵۵ء میں کراچی سے انکے قریبی عزیز ڈاکٹر ابو عاصم ایڈووکیٹ نے مکتبہ الشرق کراچی سے شائع کیا جو ۵۱۹ صفحات پر مشتمل اور ۱۳۵ اشخاص پر محیط ہے ۔

وفیات سلیمانی کی حیثیت قلب و جگر کے شکستہ ٹکڑوں کی سی ہے جنھیں سید صاحب نے معارف کے صفحات پر بکھیر دیا ہے ۔ ان کے پچاس سالہ آنسو کے قطرات ہیں جو بوند بوند بن کر سمندر کی صورت اختیار کرگئے ہیں ۔ تاریخ ساز شخصیات کی مختصر ومفصل سوانح حیات ہے جن سے تاریخ نویسی کے موضوع پر ترتیب و تنظیم کے کام میں بڑی مدد مل سکتی ہے ۔ وفیات کا دائرہ اثر اعزہ واحباب، علماء، فضلاء، ادباء، شعراء، ارباب سیاست اور اصحاب کمال سب کو محیط ہے ۔ ہندو مسلمان، عیسائی یہودی، ہندوستانی غیر ہندوستانی، جج بیرسٹر، مسٹر ملا، پیر فقیر، شاعر خطیب، مستشرق مسترشد، گوشہ نشین و گمنام، نامور و مشاہیر مختلف طبقہ ہائے فکر وعمل کے لوگ اس میں دکھائی پڑتے ہیں ۔ اگر انھیں جمع کیا جائے تو علمی وادبی پھولوں کا ایک خوشنما گلدستہ تیار ہوجاتا ہے ۔ بلاشبہ ان مضامین سے علم ادب اور تاریخ میں ایک خاص باب کا اضافہ ہوا ہے ۔

باوجودیکہ اردو ادب میں معاصر شخصیتوں سے متعلق نقوش و تاثرات اور

اور واردات و تجربات کے اظہار و انکشاف نے باقاعدہ ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے جسے خاکہ نگاری کہتے ہیں ۔ اس ضمن میں بعض کتابیں اور مجموعے نہ صرف یہ کہ اردو ادب و انشا کے شاہکار ہیں بلکہ عالمی ادب کی معیاری محفل میں نمایاں جگہ پانے کی بھی مستحق ہیں مثلاً مولوی عبدالحق کی 'چند ہم عصر' + چراغ حسن حسرت کی 'مردم دیدہ' + رشید احمد صدیقی کی 'گنج ہائے گرانمایہ' اور 'ہم نفسان رفتہ' + رئیس احمد جعفری کی 'دید و شنید' + اشرف صبوحی کی 'دلی کی چند عجیب ہستیاں' + ضیاء الدین برنی کی 'عظمت رفتہ' + شاہد احمد دہلوی کی 'گنجینۂ گوہر' + مالک رام کی 'وہ صورتیں الٰہی' + مولانا ابوالحسن علی ندوی کی 'پرانے چراغ' + عنوان چشتی کی 'عکس و شخص' اور شمیم احمد کی 'چند تصویر بتاں' ۔

سید صاحب کے وفیات کی بعض ایسی خوبیاں ہیں جو خاکہ نگاری کے مذکورہ بالا مجموعوں پر اسے فوقیت دلاتی ہیں مثلاً ان وفیاتی مضامین کی سب سے زیادہ نمایاں حیثیت تاریخی اور ادبی ہے ۔ بیسویں صدی کے اوائل نصف کی سیاسی تحریکوں اور سرگرمیوں کی تفصیلات ان میں ملتی ہیں اور وہ بھی آنکھوں کی دیکھی اور کانوں کی سنی بلکہ ہر ناٹک کے اسٹیج کے بہت قریب ایک حساس جرنلسٹ کی حیثیت سے ۔ اس لئے ہر شک و شبہ سے بالا ہیں۔ اس عہد کی نامور شخصیتوں کے حقیقی خط و خال وفیات سلیمانی کے آئینہ میں محدب شیشے کی مانند صاف اور نمایاں دیکھی جا سکتی ہیں بلکہ خود مصنف کی شخصیت کے بنیادی امتیازات بھی ہر صفحہ پر اپنا مخصوص اثر چھوڑ جاتے ہیں ۔ یہ مضامین سید صاحب کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ بھی ہیں اور ان نقوش غم کی تہہ میں مصنف کے رقیق قلب ' شرافت طبع ' محبوب دل اور متفکر دماغ کی آہیں صاف سنی جا سکتی ہیں ۔ یہ اوراق اردو ادب و انشا کے انمول جواہر پارے اور سید صاحب کی سحر آفریں انشا اور کمال تحریر کا بہترین نمونہ بھی ہیں ۔ ان مضامین کے عنوانات قائم کرنے میں بھی سید صاحب نے جدت آفرینی کا ثبوت دیا ہے۔ اکثر اس عنوان ہی سے زیر تحریر شخصیت کے امتیازی وصف کی نشاندہی ہو جاتی ہے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل چند مثالوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے ' شخصیات کے ساتھ موزوں و مناسب عنوانات کے ربط و ترتیب کا یہ حسین امتزاج ہے :

حاتم یولی کی وفات	نواب فضل اللہ خاں
ایک مجاہد کا ماتم	مولانا عرفان خاں سکریٹری مجلس خلافت
بہادر مسلمان کی وفات	نواب بہادر یار جنگ
فراق مجذوب	خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب
درویش شاعر	استاذ جلیل مانکپوری
ماتم گسار برامکہ کا ماتم	عبدالرزاق کانپوری
واحسرتا !	حسرت موہانی
فقیہ الامت	مفتی کفایت اللہ دہلوی
الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن	مولانا حمید الدین فراہی
خادمۂ ملت و مخدومۂ امت کا ماتم	والیہ بھوپال سلطان جہاں بیگم
ماتم اکبر !	اکبر الہ آبادی
ہماری جماعت کا اصل شب چراغ گم ہو گیا	عبدالرحمن نگرامی
فرنگی محل کی آخری شمع مجدد ثانی	مولانا عبدالباری فرنگی محلی

وغیرہ

وغیرہ۔

بعض اصحاب کمال کے حالات قلم بند کرنے میں سید صاحب پر بڑی سوگواری رقت اور غمناکی کی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کے نتیجے میں ان کے خامۂ عنبریں سے ادب و انشاء کے گوہر آبدار وجود میں آئے ہیں ۔ ہر سطر بلکہ ہر جملہ میں اثر آفرینی کی تجلیاں پنہاں ہوگئی ہیں ۔ بعض مشاہیر کا اندوہ گیں ماتم آج بھی پڑھنے والوں پر رقت طاری کر دیتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب رو رہے ہیں اور دوسروں کو رلا رہے ہیں ۔ عام طور پر ان ماتمی مضامین کا اختتام دعائیہ کلمات پر ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسے فقرے بھی لکھ جاتے ہیں جن سے حزن و یاس کا ایک گہرا تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر طاری ہو جاتا ہے ۔ سید صاحب نے زیر تحریر شخصیت کے علمی کمالات یا دوسرے کارناموں سے زیادہ شخصی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ۔ چونکہ مصنف خود شرافت و مروت کا پیکر اور حسن اخلاق اور پاکیزہ اطوار کا مجسمہ تھا اس لئے انھوں نے اپنے ممدوحین کے عیوب کی جستجو نہیں کی یا برائے نام کی ہے ۔ انھوں نے بعض مضامین میں ایسی فنکارانہ چابکدستی سے کردار نگاری کی ہے کہ شخصیت کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے ۔ ان تاثراتی تحریروں سے سید صاحب کی تنقیدی بصیرت اور سخن سنجی کے جلوے بھی جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں ۔

بقول ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی "وفیات کے عنوان سے ان ادبی شہ پاروں میں سید صاحب کی نثر نگاری اپنے عروج کمال پر نظر آتی ہے ۔ یہ نثر پارے در منثور کہلانے کے مستحق ہیں ۔ جا بجا نگینے کی طرح جڑے ہوئے اردو، فارسی اور عربی کے برمحل اشعار نے اسلوب میں تاثیر و زندگی کی روح پھونک دی ہے ۔ ان مضامین سے اکابر رجال علم کے سنین ولادت و وفات اور تاریخ ہند کے بہت سے اہم حوادث و وقائع کی تاریخوں کے تعین میں بڑی مدد ملتی ہے ۔ علاوہ ازیں اردو ادب کے عہد بعہد تغیر پذیر میلانات سمت اور رفتار، علمی اکتسابات اور سماجی و تہذیبی قدروں کے عروج و زوال پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ وفیات سلیمانی اردو کے ادبی ذخیرے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور وفیات سلیمانی کا مجموعہ ہی سید صاحب کو اردو کے بہترین انشاء پردازوں کی صف میں جگہ دلانے کے لئے کافی ہے۔"[14]

[14] سید سلیمان ندوی شخصیت و ادبی خدمات ـــ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی ص ۲۰۷

سید صاحب کو اپنے آبائی گاؤں دیسنہ ضلع نالندہ صوبہ بہار سے بھی بڑی محبت رہی ۔ اس کے کوچے ان کے لئے کوچے نہ تھے بلکہ اوراق مصور تھے ۔ یہاں کی ہر شکل ان کو تصویر نظر آتی ۔ چھٹیوں میں یہاں آتے اور جب جانے لگتے تو دیکھنے والے ان کی آنکھوں کو اشکبار پاتے ۔ ان کا آبائی گھر قدیم وضع کا بنا ہوا تھا لیکن اس سے بڑی محبت کرتے ۔ اس کے اندر داخل ہوتے تو ان پر وہی کیفیت طاری ہوتی جو شاہجہاں کو اپنے دہلی دروازے سے اپنے لال قلعہ میں داخل ہونے میں ہوتی ہوگی ۔ ندوہ کے قیام کے دوران ہی سید صاحب بہار کی اس محبت کو یوپی سوغات میں لے گئے ۔ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ بہت دنوں تک بہاری لکھتے رہے اور گو ان کی پوری زندگی یوپی میں گزری لیکن وہ بہار کو کبھی نہ بھولے اور جب یہاں کی کوئی قابل قدر شخصیت دنیا سے رخصت ہوئی تو آنسو بہاکر اپنی سوگواری کا اظہار کیا ۔ انہوں نے مولوی عبدالغنی صاحب وارثی، مولانا شاہ بدرالدین صاحب سجادہ نشین پھلواری، مولوی ابوالحسنات ندوی، جناب شاد عظیم آبادی، مسٹر مظہر الحق بیرسٹر، مسٹر صلاح الدین خدابخش خاں، سر علی امام، سر فخرالدین، جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا سجاد، حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی، شاہ محی الدین پھلواروی اور مولانا عبدالرؤف دانا پوری وغیرہ پر جو تعزیتی تحریریں لکھیں وہ ان کے قلم کے جواہر ریزے کہے جا سکتے ہیں ۔ بہار کے نوجوان ادیبوں کے نام ان کا جو پیام ہے اس سے آج بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے ۔ [15]

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ وفیات سلیمانی کے ذخیرے میں سید صاحب کے وطن صوبہ بہار کے مشاہیر سے متعلق سوگ ناموں کا تناسب تقریباً 25% ہے ۔ ان کی اپنی منفرد خوبیاں اور مخصوص اثرات و احساسات ہیں جو دل کے حساس تاروں کو آسانی سے چھو لیتے ہیں ۔

---

15 ۔ ۱۲ ۔ سید سلیمان ندوی ناشر بہار اردو اکادمی پٹنہ صفحہ ۱۱+۱۲

وفیات کے عنوان کے تحت سید سلیمان ندوی مدیر معارف اوّل نے جن شخصیات اور اکابر عصر کی یاد میں آنسو بہائے ہیں ان میں مندرجہ ذیل حضرات کو عام طور پر غیر معمولی شہرت حاصل ہے :

علماء و مشائخ :

شاہ بدر الدین سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ	ستمبر ۱۹۲۴ء
شاہ محی الدین پھلواروی خلف شاہ بدر الدین امیر شریعت بہار و اڑیسہ	اپریل ۱۹۴۷ء
مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار و اڑیسہ	نومبر ۱۹۴۰ء
مولانا سید انور شاہ کشمیری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند	مئی ۱۹۳۳ء
مولانا شبیر احمد عثمانی	دسمبر ۱۹۴۹ء
مولانا حکیم سید عبدالحی ناظم ندوۃ العلماء	فروری ۱۹۲۳ء
مولانا اشرف علی تھانوی	رجب ۱۳۶۲ھ
مولانا الیاس کاندھلوی	اگست ۱۹۴۴ء
مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری	مارچ ۱۹۴۸ء
مفتی کفایت اللہ	دسمبر ۱۹۵۲ء

شعرائے کرام :

مولانا اسمٰعیل میرٹھی	نومبر ۱۹۱۷ء
اکبر الہ آبادی	ستمبر ۱۹۲۱ء
علامہ اقبال	اپریل ۱۹۳۸ء
سید فضل الحسن حسرت موہانی	مئی ۱۹۵۱ء
شاد عظیم آبادی	جنوری ۱۹۲۷ء

مشاہیر عالم :

مصطفیٰ کمال پاشا	دسمبر ۱۹۳۸ء
سید رشید رضا مصری	اگست ۱۹۳۵ء

صاحبان زبان وادب :

ریم مہدی حسن افادی الاقتصادی — نومبر ۱۹۲۱ء

سید سجاد حیدر یلدرم — اپریل ۱۹۴۳ء

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی — دسمبر ۱۹۲۶ء

وحید الدین سلیم — اگست ۱۹۲۸ء

ارباب صحافت :

سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدرد و ہمدم — جولائی ۱۹۳۰ء

مولوی محبوب علی ایڈیٹر پیسہ اخبار — مئی ۱۹۳۳ء

میر ناصر علی مدیر صلائے عام دہلی — جون ۱۹۳۳ء

ارباب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی :

صاحبزادہ آفتاب احمد خان — جنوری ۱۹۳۰ء

سر راس مسعود — جولائی ۱۹۳۷ء

نواب حبیب الرحمٰن خان شیروانی رئیس بھیکم پور — اگست ۱۹۵۰ء

نواب مزمل اللہ خان — ستمبر ۱۹۳۸ء

نواب وقار الملک — جنوری ۱۹۱۷ء

ہندو صاحبان دانش :

منشی پریم چند — نومبر ۱۹۳۶ء

مہاراجہ سرکشن پرشاد — جولائی ۱۹۴۰ء

سر آشوتوش مکرجی — مئی ۱۹۲۴ء

دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ — دسمبر ۱۹۴۲ء

مشاہیر ہند :

مسیح الملک حکیم اجمل خاں — دسمبر ۱۹۲۷ء

ڈاکٹر مختار احمد انصاری — مئی ۱۹۳۶ء

مولانا محمد علی جوہر — جنوری ۱۹۳۱ء

مولانا شوکت علی — دسمبر ۱۹۳۹ء

قائد اعظم محمد علی جناح — ستمبر ۱۹۴۸ء

سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال — مئی ۱۹۳۰ء

جسٹس کرامت حسین — اپریل ۱۹۱۷ء

جسٹس امیر علی — اگست ۱۹۲۸ء

سر شیخ عبدالقادر — دسمبر ۱۹۵۲ء

خواجہ کمال الدین — دسمبر ۱۹۳۳ء

مشاہیر صوبہ بہار :

مولوی مظہر الحق — جنوری ۱۹۳۰ء

مسٹر صلاح الدین خدا بخش خاں — ستمبر ۱۹۳۱ء

سر علی امام — اکتوبر ۱۹۳۲ء

سر فخر الدین — جون ۱۹۳۳ء

مولوی عبدالغنی وارثی استھانوی — جون ۱۹۱۸ء

حاجی معین الدین ندوی — ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ
مصنف خلفائے راشدین

شاہ سلیمان پھلواروی — صفر ۱۳۵۴ھ

شاہ بدرالدین پھلواروی
شاہ محی الدین پھلواروی
مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد

(ان تینوں ناموں کا اندراج علما و مشائخ کی فہرست شروع میں ہو چکا ہے)

وابستگان دارالمصنفین + اعزا و اقربا مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی :

مولانا حمید الدین فراہی — نومبر ۱۹۳۰ء

جنید نعمانی (مولانا شبلی کے بھائی) — اپریل ۱۹۳۳ء

حامد نعمانی (مولانا شبلی کے اکلوتے لڑکے) — مارچ ۱۹۴۲ء

اہلیہ سید سلیمان ندوی — اپریل ۱۹۱۷ء

فرنگی اہل دانش و مستشرقین + نو مسلم انگریز :

پروفیسر براؤن — مارچ ۱۹۳۶ء

پروفیسر آرنلڈ — جولائی ۱۹۳۰ء

پروفیسر مارگولیتھ — اپریل ۱۹۴۰ء

مارماڈیوک پکتھال — اکتوبر ۱۹۴۶ء

۴۔ وفیاتِ سلیمانی کے چند اقتباسات

۱۔ نواب وقار الملکؒ ۲۷ر جنوری ۱۹۱۷ء

"نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبیر و سیاست کا ماتم کیا، ڈپٹی نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا، مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا لیکن نواب وقار الملکؒ کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گمشدگی پر فریاد۔ یہ ہستی گرامایہ جس نے ہماری دنیا کو الوداع کہا ہمارے کارفرما قافلہ کا آخری مسافر تھا۔ اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ۵۷ء کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہوگیا۔ وہ دور جو انگریزی کالجوں کی کائنات نہیں بلکہ بوریا نشین مدارس کا نتیجہ تھی منتہی ہوگیا۔ وہ دور جو قدیم تعلیم اور قدیم اخلاق کے نمونوں کو پیش کرتا تھا منقطع ہوگیا۔ یعنی آئندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے پلے نہ ہوں گے بلکہ انگریزی درس گاہوں کے بیٹے اور جنے ہوں گے۔ اب مشرق مشرق کی تربیت پر حکومت نہیں کرے گا بلکہ مغرب۔ اب لیڈری اور رہبری جمہور کے لیے جوش دل اور اخلاص عمل ضروری نہ ہوگا بلکہ صرف ایک کامیاب عہدہ اور ایک عمدہ سوٹ۔"[16]

۲۔ محل اولیٰ سید صاحب ۱۲ر اپریل ۱۹۱۷ء

"آخر خدا تعالیٰ کی مرضی پوری ہوئی۔ دو ماہ شدید علالت کے بعد میری رفیقۂ زندگی نے ۲۴ سال کی عمر میں اس عالم کو الوداع کہا۔ استاذ مرحوم کی وفات کے بعد یہ دوسرا سانحہ ہے جس نے میرے سکون خاطر کو درہم برہم کردیا۔ ایک یکسالہ صغیر السن بچہ کو چھوڑ کر بڑی بے کسی میں جان دی۔ اب تک ہوش بجا نہیں ہوئے۔ میری حیات منزلی کی اس بربادی کے غم میں جن احباب نے تعزیت ناموں کے ذریعہ سے شرکت کی ہے ان کا ممنون ہوں لیکن بہتر ہوتا کہ میرے بجائے دعائے خیر سے اس مرحومہ کو یاد کرتے کہ اب میری قلبی تسلی اسی کی روحانی تسکین میں ہے۔ خدا تعالیٰ اس پیکر عفت کو جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)"[17]

---

[16] معارف فروری ۱۹۱۷ء [17] معارف اپریل ۱۹۱۷ء

۳۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نومبر ۱۹۱۷ء

"بقول مولانا شبلی مولانا حالی کے بعد کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔ افسوس کہ دوسرا حالی بھی اس ہفتہ ہماری دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اردو کا سہل و رواں کلام ہمارے بچوں کا ابتدائی سبق تھا۔ وہ اپنی پیرانہ سالی کی شکستہ زبان سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس پیار سے سمجھاتے تھے کہ وہ نعمت کی گراں باری کو کھلونا سمجھ کر اٹھا لیتے تھے۔ افسوس کہ یہ کھلونے بنانے والا بھی اب نہ رہا۔"[18]

۴۔ مولانا محمد علی جوہر ۴ جنوری ۱۹۳۱ء

"افسوس وہ پُردرد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہو ہو جاتا تھا اور اوروں کو بیتاب کرتا تھا، دریغا کہ قیامت تک کے لئے ساکن ہو گیا۔ وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چہکتے تھے ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے۔ وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چلتی تھی اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی۔ وہ پُر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہائے جاتا تھا اس کا تلاطم ہمیشہ کے لئے تھم گیا۔ وہ پُرزور دست و بازو جو شب و روز کی خدمت گزاری اور نبرد آزمائی میں معروف تھے وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے۔ افسوس! شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعداد کے نرغہ میں تنہا لڑ رہا تھا آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہوگا۔ الوداع محمد علی! الوداع! والسلام الیٰ یوم القیامہ۔

تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو۔ تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا، زیبا ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے۔ تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا، سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے۔ ہندوستان کا ماتمدار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لئے غم زدہ، بلقان کے لئے اشکبار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا شریک غم

[18] معارف نومبر ۱۹۱۷ء

اور بیت المقدس کے لئے وقف الم۔ اے ہند کے آوارہ گرد مسافر! ترا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا۔ مناسب یہی تھا کہ تیرے لئے اولین قبلۂ اسلام کا سینہ کھل جائے اور تو اس میں سما جائے۔

وہ مشرق کی سرزمین میں پیدا ہوا لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی۔ مشرق کی مٹی سے جنم لیا لیکن مغرب کے ہتھیاروں سے اس نے اپنا جسم سجایا۔ اس کا دماغ مغربی مگر دل مشرقی تھا۔ وہ مشرق کی حمایت میں بارہا مغرب سے مغرب کے ہتھیاروں سے لڑا اور اس نے اس کا لوہا مانا۔ وہ مشرق کا آفتاب تھا، یہ آفتاب بھی اگر مشرق میں طلوع ہو کر مغرب میں ڈوبا تو دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوا اور اسی لئے حق تھا کہ مشرق و مغرب کا متحدہ مرکز (بیت المقدس) اس کا مدفن بنے۔ اے مشرق و مغرب کے مالک! تو اپنی رضامندیوں کے پھول سے اس کا دامن بھر دے (آمین)"۔

۵۔ علامہ اقبال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

"وَقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ" آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا۔ صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی ۶۱ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں ۴۰ برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا۔ آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی۔ ایسا عارف، فلسفی، عاشق رسول صلعم، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو۔ اس کے دھن کا ہر ترانہ بانگ درا اور اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم۔ اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کا ہر پرواز بال جبریل تھا۔ اس کی فانی عمر تو ختم ہو گئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا۔ امید ہے کہ ملت کا یہ غم خوار شاعر اب عرش الٰہی کے سایہ میں ہو گا اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے۔ خداوندا اس کے دل شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا غم خواری کر اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلب حزیں کو مسرور کر۔ (آمین)

اقبال صرف شاعر نہ تھا وہ حکیم تھا۔ وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گمراہی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے نوشتہ چیں بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور

---

۱۹ معارف جنوری ۱۹۳۱ء

رموز فطرت کا آشنا تھا ۔ وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھلاتا تھا یعنی بادۂ انگور کو نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا ۔

اقبال، ہندوستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال، فضل و کمال کا پیکر اقبال، حکمت و معرفت کا دانا اقبال، کاروان ملت کا رہنما اقبال! رخصت، رخصت، الوداع الوداع سلام اللہ علیک و رحمتہ الی یوم التلاق" [۲۰]

۶۔ سر راس مسعود ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء

"مرحوم بڑے وجیہہ، کشیدہ قامت، سرخ و سپید، ہنس مکھ اور ملنسار تھے۔ جس مجلس میں ہوتے سر پر چھا جاتے۔ باتوں کے دھنی اور زبان کے پکے تھے، ہر شخص سے جھک کر ملتے تھے۔ ایک بار جبکہ وہ حیدرآباد میں ناظم تعلیمات تھے میرا حیدرآباد جانا اور ایک دوست کے ہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا جن سے پہلے گو ان سے بہت میل ملاپ تھا مگر یکایک بیچ میں ایسی کرکری ہو گئی تھی کہ ملنا جلنا اور بات چیت تک بند ہو گئی تھی۔ میں جب ان سے جا کر ملا تو انہوں نے پوچھا کہاں ٹھہرے ہو۔ میں نے جگہ بتائی تو وہ چپ سے ہو گئے۔ میں مطلب سمجھ گیا۔ دو تین دن کے بعد دیکھتا کیا ہوں کہ وہ بے تکلف وہاں چلے آرہے ہیں۔ میرے ان دوست کو اچھا سا ہو گیا اور اس دن وہ ان کے حسن خلق کے قائل ہو گئے۔" [۲۱]

۷۔ مولانا سید انور شاہ کشمیری ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء

"مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے۔ ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کے اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا۔" [۲۲]

---

[۲۰] معارف مئی ۱۹۳۸ء [۲۱] معارف اگست ۱۹۳۷ء [۲۲] معارف جون ۱۹۳۳ء

۸۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء

"وہ فیاضی کا مجسمہ، لطف و محبت کا پیکر اور حسن اخلاق کا فرشتہ تھے۔ متانت اور سنجیدگی ان کی طینت اور غور و فکر ان کی عادت تھی۔ وہ وطن کے خدمت گار، انسانیت کے غم خوار اور اسلام کے پرستار تھے۔ وہ دنیا میں اتحاد اسلامی کے پیغامبر اور ملک میں ہندو مسلم اتحاد کے مبلغ تھے۔ ان کی پالٹکس کے سولہ برسوں میں طوفان سیاست کے سیکڑوں جھونکے اٹھے اور سیاسی انقلاب خیال کے بیسیوں حادثے پیش آئے مگر صداقت اور راست بازی کا یہ پہاڑ جوں کا توں اپنی جگہ پر جما رہا۔
اب زمین کا یہ فرشتہ ہمارے شور و شر کی سرزمین سے بہت دور امن و راحت کے آسمان پر چلا گیا۔ اس کا جسم خاکی دلی کے ایک کھنڈر میں ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا ہوا، اب زمانہ کے حوادث اس کو رنجیدہ، عالم اسلامی کی زبوں حالی اس کو آلودہ اور وطن کی غلامی اس کو افسردہ نہیں بنائے گی۔ اس کا تن خاکی اب ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح زمین کے بچھونے پر ابدی نیند سو رہا ہے اور اس کی روح ہماری مدح و ستائش سے بے پروا اور ہمارے نوحہ و ماتم سے بے خبر اپنے نیک اعمال کا تحفہ لئے خداتعالیٰ کے سامنے ہے۔ امید ہے کہ مغفرت کا نورانی خلعت اس کے جسم پر اور نوازش کا تاج اس کے سر پر ہوگا۔" ۲۳

۹۔ مولانا ابوالمحاسن سجاد ۲۳ نومبر ۱۹۴۰ء

"فلسفہ و تاریخ کے ماہر کہتے ہیں کہ علم و عمل کم یکجا ہوتے ہیں لیکن کمیاب مثالوں میں مولانا سجاد کی ذات تھی۔ وہ اپنے وقت کے بڑے مشاق مدرس اور حاضر العلم عالم تھے خصوصیت کے ساتھ معقولات اور فقہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ صوبہ بہار میں امارت شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت ہے۔ زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں۔" ۲۴

---

۲۳ معارف مئی ۱۹۳۶ء ۲۴ معارف دسمبر ۱۹۴۰ء

(۲) معارف کی ادارتِ دوم کے شذرات و وفیات

۱۔ شذراتِ معینی کا جائزہ

جون ۱۹۵۰ء کے معارف میں سید سلیمان ندوی کے آخری شذرات شائع ہوئے جن کا آخری ٹکڑا حسب ذیل ہے:

"ہم ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہیں، لیکن یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہ کر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہیں۔ جس کی مثالیں انگریزوں کی دی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان میں بکثرت تھیں۔"[25]

۱۹۵۱ء میں سید صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد معارف کی ادارت کا خصوصی بوجھ شاہ معین الدین احمد ندوی کے کندھوں پر آ پڑا جس کو انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ اور کمال ہنرمندی کے ساتھ نبھایا۔ سید صاحب اپنے اس لائق شاگرد کی شخصیت اور تحریر سے کس حد تک مطمئن اور خوش تھے اس کا اندازہ خود شاہ صاحب ہی کی تحریر سے ہوتا ہے:

"ایک مرتبہ میری کسی تحریر کے جواب میں سید صاحب نے لکھا تھا کہ پہلے دارالمصنفین ایک شخص (مولانا شبلی) کی یادگار تھا، اب اس کو دو کی یادگار سمجھ کر زندہ رکھو۔" میں نے سمجھا دو لکھا ہے۔ اس کے جواب پر اظہار اطمینان فرمایا اور لکھا کہ آپ اس کے اس اقرار سے خوش ہوئے کہ آپ دارالمصنفین کو دو کی یادگار سمجھ کر باقی رکھنے کی کوشش کریں گے۔ ایک دوسرے موقع پر میری حوصلہ افزائی فرمائی "اچھا کیا کہ کہیں کا قصد نہیں کیا۔ دارالمصنفین کے باہر قدم نہ رکھیں۔ اس کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔ ورنہ لاکھوں کا سرمایہ اور عمروں کا حاصل تباہ ہو جائے گا۔" مارچ ۱۹۵۱ء کے ایک خط میں

---

[25] شذرات معارف ۱۹۵۰ء

تحریر فرمایا "آپ کے ہونے کو میں اپنا ہی ہونا سمجھتا ہوں اور مجھ کو آپ کی قائم مقامی سے ویسی ہی خوشی اور طمانیت ہے جو کسی روحانی اور جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہو سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی موت کے بعد کا نقشہ دیکھ لیا۔ اب آپ سے جہاں تک ہو سکے دین و ملت کی خدمت سمجھ کر اس کام کو انجام دیں اور ساتھ ہی اپنے رفقائے کار کی تیاری میں مصروف رہیں تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہے اور استاد مرحوم کا سلسلہ قائم رہے۔ الحمدللہ آپ نے معارف اور شذرات کے معیار کو قائم رکھا اور 'س' اور 'م' میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہوتا ہو۔ واللہ الحمد"[26]

مندرجہ بالا سطور اور خطوط سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ سید صاحب شاہ صاحب کے کام اور صلاحیت سے اپنی زندگی میں مطمئن تھے اور ان کی تحریر بالخصوص شذرات کو اپنی ہی تحریر کا عکس گردانتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے شفیق و محسن سید صاحب کے اس حسن ظن کو آخر وقت تک قائم رکھا اور معارف کے قارئین کو سید صاحب کی جدائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ شاہ صاحب کے شذرات میں وہی فصاحت و بلاغت اور اثر انگیزی ہے جو سید صاحب کے شذرات کا خاصہ رہا ہے نیز دقیقہ فہمی، نکتہ دانی اور حق گوئی کا وہی مزاج اور رجحان ہے جو ان کے استاد کو حاصل تھا اور جو انہیں ورثہ میں ملا۔

شاہ صاحب نے معارف کے شذرات میں سید صاحب کے اسلوب اور طریقہ کار کی پوری پوری پیروی کی اور اس کے معیار میں اور وقار میں قطعاً فرق نہ آنے دیا۔ ان کا استدلال منطقی ہوتا تھا اور تحریر میں توازن پایا جاتا تھا۔ ان کے شذرات سے ان کی ایمانی حرارت، اسلامی جرأت مندی اور ماسوا اللہ کسی سے ہراساں نہ ہونے کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ ملی و ملکی مسائل پر نہایت بیباکی سے انہوں نے اظہار خیال فرمایا اور بہت ہی زوردار ایڈیٹوریل لکھے جن میں خاص طور پر اپنی قوم کے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی بھی کی اور ان کی رہبری و رہنمائی بھی۔ ان کی باتیں مخلصانہ و مشفقانہ ہوتی تھیں جن کے حرف حرف سے خلوص و محبت اور وابستگی و شیفتگی کے موتی ٹپکتے تھے۔

---

[26] شذرات معارف فروری ۱۹۵۴ء

۲-شذرات معینی کے چند اقتباسات

۱۔ مسلمانوں کے تئیں شرپسندوں اور فرقہ پرستوں کی دل آزاری نیز حکومت کے سرد رویہ اور سیکولرزم کی تشریح کے موضوع پر شاہ معین الدین احمد اظہار خیال فرماتے ہیں :

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے اس کو اخلاق و تہذیب اور انسانیت و شرافت سے بھی آزادی مل گئی ہے ۔ خصوصاً مسلمانوں کے معاملہ میں کسی کے زبان و قلم پر کوئی احتساب نہیں رہ گیا ہے ۔ جس کی زبان پر جو آتا ہے کہہ گزرتا ہے ۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمان جن مشکلات میں مبتلا ہیں اور [illegible] کے جن حالات سے گزر رہے ہیں وہی کیا کم ہے کہ فرقہ پرستوں نے ان کی دل آزاری کے لئے ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کی تحقیر و تذلیل شروع کر دی ہے اور ادھر برسوں سے کتابوں، مضامین اور تقریروں میں علانیہ ان کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے، مگر اس کی کوئی باز پرس نہیں کی جاتی ۔ اگر مسلمانوں کی زبان و قلم سے اس کا عشر عشیر بھی ہندو مذہب کے خلاف نکل جاتا تو اس پر قیامت آجاتی ۔ مگر حکومت اس فتنہ انگیزی کی جانب کوئی توجہ نہیں کرتی ۔

اسلام پر اس قسم کا حملہ شیشہ کے گھر میں بیٹھ کر قلعہ پر پتھر پھینکنے کے مترادف ہے ۔ مسلمان اس کا پورا جواب دے سکتے ہیں مگر حکومت کے مقابلہ میں مجبور و بے بس ہیں ۔ اگر مسلمانوں کے قلم سے ایک لفظ بھی ہندو مذہب کے خلاف نکل جاتا ہے تو فوراً حکومت کی مشنری حرکت میں آجاتی ہے ۔ یہ سیکولرزم کی بالکل نئی قسم ہے ۔ آخر حکومت کب تک مسلمانوں کی توہین و تحقیر کا تماشہ دیکھتی اور ان کے ضبط و تحمل کا امتحان لیتی رہے گی ۔ اس کو کچھ تو اپنے سیکولرزم کی لاج رکھنی چاہئے ۔ کسی فرقہ کے مذہب کو برا بھلا کہنا قانون اور تہذیب و شرافت سب کے خلاف ہے مگر افسوس ہے کہ ہندوستان اس سبق کو بھی بھولتا جا رہا ہے ۔ کم از کم اس معاملہ میں اس کو پاکستان سے سبق حاصل کرنا چاہئے جہاں سے ایک آواز بھی ہندو مذہب کے خلاف سننے میں نہیں آتی ۔

ہندوستان میں سیکولرزم اور قوم پروری اور فرقہ پرستی کے بھی نئے معنی ہیں ۔ سیکولرزم کے معنی اکثریت کی تہذیب کا غلبہ و تسلط اور اقلیت کے حقوق کی پامالی ۔ قوم پروری کا مفہوم اکثریت کا قول و عمل خواہ وہ اس کے سراسر خلاف کیوں نہ ہو اور فرقہ پرستی کے معنی اقلیت کی آواز ہے اور اقلیت کا ہر فرد فرقہ پرست ۔ حتی کہ وہ لوگ اور وہ اخبارات بھی جن کی پوری عمر

قوم پروری میں گزری اور جن کا دامن فرقہ پرستی کے داغ سے پاک ہے محض جمہوریت کے عطا کردہ حقوق کے تحفظ اور جمہوریت کو صحیح معنی میں جمہوریت بنانے کی کوشش کے جرم میں فرقہ پرستی کے الزام سے نہ بچ سکے اور فرقہ پرستوں کی نگاہ میں وہی قوم پرور ہے جو اپنی ہر چیز کو ان کی خوشنودی کے لئے نثار کردے۔" [27]

۲۔ شاہ صاحب اس دنیا میں برائیوں کی اصل جڑ ہماری زندگی میں روحانیت کے فقدان کو بتاتے ہیں اس سلسلہ میں معارف کے ایک شذرہ میں روشنی ڈالتے ہیں:

"جو تمدن و نظام حیات خدائے واحد کے یقین اور مذہب و روحانیت کے تصور سے خالی ہے اور جس کی بنیاد تمام تر مادیت پر ہو اس کا لازمی نتیجہ خود غرضی اور فساد فی الارض ہے۔ صرف زبان سے خدا کا نام لے لینا اور کسی مذہب کی جانب انتساب کافی نہیں ہے، جب تک کہ اعمال میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو۔ انسانی فطرت خود غرض اور نفس پرست واقع ہوئی ہے۔ اس کو روکنے والی چند چیزیں ہیں۔ کسی اعلیٰ و برتر اور دانا و بینا ذات اور غالب و عادل قوت کا یقین، اعمال کے دنیوی و اخروی محاسبہ و مواخذہ کا خوف، ذاتی اخلاقی احساس و شرافت انسانی کا جذبہ۔ درحقیقت زندگی کے بارے میں موجودہ تمدن کے خالص مادی تصور کے ساتھ پاکیزہ اخلاقی احساس کا اجتماع ہو ہی نہیں سکتا۔" [28]

۳۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر فرقہ پرستوں کا یہ اعتراض بڑی شد و مد سے دہرایا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوستانی کلچر، اس کی روایات اور اس کے ہیروؤں کو نہیں اپنایا اور یہاں رہ کر بھی وہ اجنبی رہے۔ شاہ صاحب نے کسی قدر طوالت کے ساتھ لیکن مدلل جواب اس سوال کا ایک شذرہ میں دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ حق گوئی کا حق ادا کیا ہے:

"کلچر ایک مبہم اصطلاح ہے جس کے معنی و مفہوم کا صحیح تعین آج تک نہ ہو سکا ہے۔ ہر شخص اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس کی تاویل کرتا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ کلچر پورے نظام زندگی پر حاوی ہے جس سے اس کا کوئی پہلو بھی خارج نہیں ہے۔ اس بحث کو مختصر کرنے کے لئے اس کی دو موٹی تفسیریں کی جا سکتی ہیں ـــــ

ا۔ کلچر کا معنوی اور داخلی رخ ـــــ اس سے مراد کسی قوم و ملت کے وہ بنیادی عقائد

---

[27] شذرات معارف ستمبر ۱۹۵۳ء   [28] شذرات معارف جون ۱۹۵۴ء

و تصورات ہیں جن کی روح اس کے سارے نظامِ زندگی میں جاری رہتی ہے اور جس پر اس کی قومی و ملی خصوصیات، اس کی انفرادیت اور اس کے وجود کا مدار ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی قوم بھی جو ایک اعلیٰ کلچر کی مالک ہو اس کو نہ بدل سکتی ہے اور نہ اس کے رخ میں کسی دوسرے کا اثر قبول کر سکتی ہے۔ اس کو وہی قومیں بدلتی ہیں جن کا کلچر اصلاح و تکمیل کا محتاج ہوتا ہے۔ اور جو قوم جس حد تک بھی دوسرے کلچروں کا اثر قبول کرے گی اس حد تک اس میں ضم ہو جائے گی اور اس کی اپنی خصوصیات ختم ہو جائیں گی۔

مسلمانوں کے کلچر کا مدار ان کے مذہب پر ہے جس کے بنیادی عقائد و تصورات ناقابلِ تغیر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کلچر اس قدر اعلیٰ اور مکمل ہے کہ اس سے دوسرے کلچروں کو روشنی ملتی ہے اور ان کو اصلاح حاصل ہوتی۔ اس لئے وہ خود دوسرے کلچر کا اثر قبول نہیں کر سکتے۔

ii۔ کلچر کا ظاہری اور خارجی رخ ــــ جس کو تہذیب و معاشرت کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی مذہب کے دائرہ سے خارج نہیں ہے لیکن تہذیب و معاشرت کے کچھ پہلوؤں کو مذہب سے کوئی بنیادی تعلق نہیں ہے مثلاً رہنے سہنے کے طریقے، کھانے پینے ملنے جلنے کے آداب، لباس، ساز و سامان، علوم و فنون وغیرہ۔ اس لئے ان میں دوسری تہذیبوں کا اثر قبول کیا جاتا ہے اور یہ اثر پذیری بالکل فطری ہے۔ جب دو قومیں اور دو تہذیبیں آپس میں ملیں گی تو ان کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا بالکل فطری ہے۔ خصوصاً ادنیٰ تہذیب اعلیٰ تہذیب کا اثر لازمی طور پر قبول کرے گی۔ اس لئے اسلام نے ایک خاص حد تک تہذیبی اخذ و استفادہ کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ مسلمان بھی دوسری تہذیبوں سے متاثر ہوئے مگر وہ ایک اعلیٰ ترین کلچر کے مالک تھے اس لئے جن تہذیبوں کا اثر انھوں نے قبول کیا ان کو اپنے کلچر کے رنگ میں اتنا رنگ دیا کہ اس کی شکل اور اس کا مزاج بالکل بدل گیا۔

اس سے انکار نہیں کہ قدیم ہندوستان میں بھی بہت سے کمالات، علوم و فنون اور قابلِ استفادہ چیزیں تھیں جن سے مسلمانوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ان سے اپنے تہذیبی ذخیرہ میں اضافہ کیا مگر ہندوستان کے داخلی کلچر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کی ان کو ضرورت اور طلب ہوتی اور جس سے ان کے افکار و تصورات اور نظامِ زندگی میں کوئی انقلاب پیدا ہوتا یا اصلاح و ترقی ہوتی۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں نے ہندوستان کو ایسی چیزیں دیں جس کی ان

کو ضرورت تھی اور جس نے ان کے پرانے عقائد و تصورات اور نظام زندگی میں تغیر اور ان کے کلچر میں
اصلاح و ترقی کا احساس پیدا ہو۔ انھوں نے ہندوستان کو توحید خالص سے آشنا کیا۔ انسانوں میں
اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق مٹا کر اخوت و مساوات کا سبق اور انسانی غلامی سے آزادی کا پیغام دیا
اور انسانیت کی عظمت قائم کی۔ اوہام و خرافات کی زنجیروں سے آزاد کر کے حقیقت شناس
بنایا اور اس قبیل کے بہت سے نئے خیالات دئے جس سے ہندوستان کے پرانے تصورات اور نظام
زندگی میں انقلاب پیدا ہو گیا اور ان میں اپنی اصلاح و ترقی کا احساس پیدا ہوا۔

اس اعتراض کا دوسرا جزء یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستانی روایات اور یہاں کے
ہیروؤں کو نہیں اپنایا۔ اس کا جواب بھی جیسا کہ اوپر دیا جا چکا ہے مزید وضاحت کے لئے
عرض ہے کہ کسی قوم کی روایات درحقیقت اس کے ملت اور کلچر کے داخلی رخ کا جزء ہوتی ہیں
اس لئے نہ صرف مسلمان بلکہ کوئی قوم بھی دوسری قوم کی روایات کو نہیں اپنا سکتی ورنہ اس کی ملی خصوصیت ختم اور
اس کی تاریخ مسخ ہو جائے گی۔ رہا ہیروؤں کا مسئلہ تو مسلمانوں میں ان معنوں میں ہیرو پرستی ہے ہی نہیں
جن معنوں میں دوسری قوموں میں پائی جاتی ہے کیونکہ اسلام نے شخصیت پرستی کی مخالفت کی ہے۔ البتہ عظیم
شخصیتوں اور اپنے محسنوں کا احترام اور ان کی عزت ضرور کرتے ہیں اور اس لحاظ سے مسلمانوں کا ہیرو
وہی ہو سکتا ہے جس نے کوئی ایسا دینی و ملی کارنامہ انجام دیا ہو جس سے ملت اسلامیہ کو فائدہ پہونچا ہو
اور ایسا شخص مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ اس زمانے کے مسلمانوں نے جن دنیاوی سلاطین اور کشور کشاؤں
کو اپنا ہیرو بنا لیا ہے وہ محض دوسری قوموں کی نقل و تقلید ہے ورنہ کوئی مسلمان حکمران جس نے دینی
و ملی کارنامہ انجام نہ دیا ہو وہ مسلمانوں کا ہیرو نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں کسی غیر مسلم کے ہیرو بننے
اور ماننے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ البتہ جن برگزیدہ شخصیتوں نے انسانیت کی کوئی خدمت
کی ہے یا کوئی بڑا روحانی یا اخلاقی انقلاب پیدا کیا ہے مسلمان ان
سب کا احترام کرتے ہیں اور اس معاملے میں مسلم یا غیر مسلم کی تخصیص
ہرگز نہیں۔" [۲۹]

۲۸۔ اس وقت کے وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بدرالدین طیب جی
کے اسلامی رجحانات کو فروغ دینے اور اصلاحات قائم کرنے پر شاہ صاحب

---

۲۹ شذرات معارف جولائی ۱۹۷۰ء

اپنی صحافتی ذمہ داری کو مندرجہ ذیل الفاظ میں پورا کرتے ہیں :

" مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نئے وائس چانسلر مسٹر بدرالدین طیب جی توقع سے زیادہ یونیورسٹی کے لئے مفید ثابت ہو رہے ہیں ۔ چند دنوں کے اندر انھوں نے جو اصلاحات کی ہیں ۔ اور آئندہ جو اصلاحات اور علمی وتعلیمی منصوبے ان کے پیش نظر ہیں ان سے نہ صرف یونیورسٹی کا تعلیمی معیار بلند ہوسکے گا بلکہ وہ اسلامیات اور علمی تحقیقات کا بھی بڑا مرکز بن جائے گا اور پورے ملک میں اس کا علمی و تعلیمی وقار قائم ہو جائے گا ۔ مسلم یونیورسٹی محض شاندار عمارتوں ، وسیع سبزہ زاروں ، خوشنما کوٹھیوں ، خوش لباس طلبہ اور جامہ زیب پروفیسروں کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی اصلی روح علمی و تعلیمی اور اس کی امتیازی خصوصیت اس کی اسلامیت ہے اور یہ امر قابل اطمینان ہے کہ وائس چانسلر صاحب کی نظر ان سب پہلوؤں کی جانب ہے ۔ وہ اس کی اسلامیت کے اظہار سے گھبراتے نہیں بلکہ اپنی تقریروں میں برملا اس کا اعلان کرتے ہیں اور اس کو قائم رکھنا چاہتے ہیں ۔ اس لئے توقع ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں یونیورسٹی میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں اور وہ جس غلط راستہ پر جا رہی تھی اس کی پوری اصلاح و تلافی ہو جائے گی اور وہ ملک و وطن اور دین و ملت سے متعلق اپنے فرائض بھی پوری طرح ادا کرے گی ۔" [30]

---

[30] شذرات معارف مئی ۱۹۶۳ء

۳۔ وفیات معینی کا جائزہ

شاہ معین الدین احمد ندوی کو اپنے مشفق و کرم استاذ سید سلیمان ندوی کی کراچی (پاکستان) میں رحلت کی اطلاع ۱۳ نومبر ۱۹۵۳ کو سب سے پہلے ریڈیو پاکستان کے ذریعے اور پھر بذریعہ مراسلت سید صاحب کے داماد سید ابو عاصم ایڈوکیٹ کے ذریعہ موصول ہوئی۔ اس حادثہ سے دارالمصنفین کا پورا حلقہ سوگوار ہو گیا اور معارف کے دفتر میں صف ماتم بچھ گئی۔ شاہ صاحب کے لئے تو سید صاحب بہت کچھ بلکہ سب کچھ تھے اس لئے ان کا متاثر ہونا تو قدرتی بات تھی۔ چنانچہ اس حادثہ سے متاثر ہو کر شاہ صاحب نے معارف کے شذرات میں جو معرکۃ الآرا سوگ نامہ لکھا وہ تاثر اور اثر انگیزی کے اعتبار سے مرثیہ نگاری کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے اپنے دل کے ٹکڑوں کو معارف کے صفحات پر پھیلا دیا اور انشاء پردازی کے ایسے جواہر بکھیرے جن کا ہر دانہ گوہر نایاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہ صاحب کے قلم کا یہ تاثر اور کمال ان کے وفیات کے عالم میں شروع سے آخر تک قائم رہا۔ اور اس معاملے میں ان کی تحریر ایسے نگارش کے نمونے کمال پر نظر آتی ہے جو پسندیدہ اور قابل قدر ہے۔

مندرجہ ذیل سطور میں ان چند اہم سوگ ناموں کی فہرست پیش کی جاتی ہے جو شاہ معین الدین احمد ندوی کے قلم سے نکلے یا جن کا تعلق شاہ صاحب کے دور نظامت و ادارت سے ہے :

شذرات معارف

علماء و مشائخ :

خواجہ حسن نظامی — خانوادۂ نظامیہ کے پیر طریقت اور نامور اہل قلم — اگست ۱۹۵۵ء

مولانا محمد یعقوب مجددی بھوپالی — عارف کامل اور نامور شیخ طریقت — جون ۱۹۷۰ء

شعرائے کرام :

اقبال سہیل — مولانا شبلی کے شاگرد اور اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر — نومبر ۱۹۵۵ء

روش صدیقی — مشہور شاعر — فروری ۱۹۷۱ء

مشاہیر عالم :

سلطان عبدالعزیز آل سعود

غلام محمد — سابق گورنر جنرل پاکستان — ستمبر ۱۹۵۶ء

ہندو صاحبان دانش :

سر شانتی سروپ بھٹناگر — سائنس داں + غالب کے مشہور شاگرد ہرگوپال تفتہ کے نواسے + اردو کے خوش مذاق ادیب و شاعر (لاجونتی کے نام سے مجموعہ کلام) — جنوری ۱۹۵۵ء

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی — شاعر و ادیب، گنگا جمنی تہذیب کے علم بردار — نومبر ۱۹۵۵ء

پنڈت کشن پرشاد کول — سیاست داں، اردو کے نامور ادیب + SERVANT OF INDIA تنظیم کے رکن رکین — فروری ۱۹۶۶ء

صاحبان زبان و ادب :

قاضی عبدالغفار — نامور ادیب — فروری ۱۹۵۶ء

ڈاکٹر اعجاز حسین — سابق صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی — مارچ ۱۹۷۵ء

ارباب صحافت :

مولانا ظفر علی خان — ایڈیٹر اخبار زمیندار، مشہور قومی رہنما — دسمبر ۱۹۵۶ء

مولانا غلام رسول مہر — دسمبر ۱۹۷۱ء

سیاسی رہنما و قومی کارکن :

آصف علی
شفیق الرحمٰن قدوائی — اپریل ۱۹۵۳ء

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی — جون ۱۹۷۴ء

متعلقین دارالمصنفین :

مولانا سید سلیمان ندوی — نومبر ۱۹۵۳ء

مولانا عبدالسلام ندوی — مولانا شبلی کے شاگرد رشید، دارالمصنفین کے پرانے رکن رکین، سید صاحب کے دست راست، بہترین صاحب قلم اور انشا پرداز، نصف صدی تک علم و فن کے خدمت گزار — اکتوبر ۱۹۵۶ء

۴۔ وفیات معینی کے چند اقتباسات

۱۔ سید سلیمان ندوی ۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء (ربیع الاول ۱۳۷۳ھ) شذرات معارف نومبر ۱۹۵۳ء

سید صاحب کی وفات پر "آہ! سید صاحب — علم و اخلاق کی دنیا اجڑ گئی" کے عنوان سے قائم مقام مدیر معارف شاہ معین الدین احمد ندوی نے جس طرح خون کے آنسو بہائے وہ ایک طرف ادب و انشاء کا اعلیٰ نمونہ ہے تو دوسری طرف سیرت نگاری کا بہترین مرقع۔ اس تاریخی سوگنامے کے چند ٹکڑوں اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

"بالآخر اس مسیحا نفس نے بھی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی جو عمر بھر اپنی زبان و قلم سے مردہ دلوں میں روح حیات پھونکتا رہا۔ امراض ملت کا وہ ماہر طبیب اٹھ گیا جس نے اس کے ناتواں جسم میں نئی طاقت و توانائی پیدا کی وہ چشمہ فیض خشک ہوگیا جس کی آبیاری سے دین و ملت کا چمن سیراب تھا۔ وہ شیخ کامل اٹھ گیا جس نے دلوں کی دنیا منور کی۔ وہ شمع خاموش ہوگئی جو نصف صدی تک علم و فن کی ہر مجلس ضیا بار کرتی رہی۔ وہ تاجدار رخصت ہوگیا جس کا سکہ علم و فن کی پوری تاریخ میں رواں تھا۔ اسلامی علوم کا وہ امام و مجدد اٹھ گیا جس نے ان کو نئی زندگی بخشی۔ مذہب اسلام کا وہ متکلم اور اسلامی تاریخ و تمدن کا وہ محقق اٹھ گیا جس نے ان کو ان کی اصلی شکل اور نئے لباس میں جلوہ گر کیا۔ پیغام محمدیؐ کا وہ شارح و ترجمان خاموش ہوگیا جس نے اپنی دینی بصیرت سے اس کے اسرار و حکم بے نقاب کیے اور اس کی ذات جامع الصفات ہر علوم کی جامعیت کا خاتم ہوگیا۔"

"اس کے اعمال و اخلاق خلق عظیم کی عملی تفسیر تھے۔ وہ فطرتاً پاک دل، پاک طینت، سراپا شرافت و انسانیت، سراپا خلق و مروت، سراپا مہر و محبت اور سراپا جمال تھا۔ عزیزوں کا معاون و مددگار، دوستوں کا ہمدرد اور غمگسار اور غریبوں اور بے کسوں کا

ہمدرد و غم خوار تھا۔ ضبط و تحمل کا پہاڑ، ایثار و قربانی کا پیکر اور عفو و درگذر کی تصویر تھا۔
اس کو خدا نے حقیقتاً بزرگی بخشی تھی اس لئے مصنوعی اور خود ساختہ بزرگی کے پیچھے نہیں پڑا اور
دنیاوی جاہ و اقتدار کی ہوس سے ہمیشہ دور اور کبر و نخوت سے نفور رہا۔"

"ملک و قوم، دین و ملت اور علم و فن کا کوئی رخ اور کوئی پہلو بھی اس کی
خدمات سے خالی نہیں ہے۔ اس راہ میں اس کے کارنامے بڑے عظیم الشان اور گوناگوں ہیں اس لئے
اس کی موت درحقیقت ایک حادثہ نہیں مجموعہ حوادث ہے اور اس کا ماتم درحقیقت ایک شخص
کا نہیں پوری قوم کا ماتم ہے، خلق و شرافت کا ماتم ہے اور پوری ملت اسلامیہ اس کے غم
میں سوگوار ہے کہ آج غزالی اور رازی، ابن تیمیہ ابن قیم، رومی و سنائی، شاہ عبدالحق
اور شاہ ولی اللہ کی یادگار دنیا سے اٹھ گئی اور شبلی کی مسند ویران ہو گئی۔

ایسی ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں ——

سرود رفتہ باز آید کہ ناید + نسیمے از حجاز آید کہ ناید
برفت از بزم عرفاں آں حکیمے + دگر دانائے راز آید کہ ناید

اس نے علم و ادب کے ہر شاخ اور ہر موضوع پر ہزاروں صفحات
لکھے مگر اس کی عمر عزیز کا بڑا اور بہترین حصہ آستانہ نبویؐ کی
خدمت گزاری میں بسر ہوا۔ اس کا سب سے بڑا علمی و دینی کارنامہ خاتم النبیینؐ
کی سیرت پاک ہے جو سوانح نبوی کے ساتھ پیغام نبوی کا خلاصہ
اور عطر ہے۔ دارالمصنفین میں اس کی تصنیفی زندگی کا آغاز اس
مبارک کام سے ہوا تھا اور ابھی جلد ہفتم پر تالیف تھی کہ اس پر
اس کا خاتمہ ہو گیا اور رحمت للعالمین کا مداح سیرت نگار یہ سوغات لیکر خدا تعالیٰ
کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا۔
اے خدا کے مقبول بندے الوداع۔ اے استاد شفیق الوداع"[31]

---

[31] شذرات معارف نومبر 1953ء

۲ ۔ رفیع احمد قدوائی　　　　　　شذرات معارف نومبر ۱۹۵۴ء

شاہ معین الدین احمد ندوی اس مخلص خادم قوم اور عظیم محب وطن کے اظہارِ غم کے موقع پر اس کے اوصاف و محاسن کی ذکر نگاری یوں کرتے ہیں :

" وہ اپنے بہت سے اوصاف اور خصوصیات میں فرد تھے ۔ ان کی پوری زندگی ملک و قوم کی بے لوث خدمت میں گزری اور اس راہ میں بڑی قربانیاں کیں ۔ وہ ہندوستان کی جہادِ آزادی کے سرفروش مجاہد، میدانِ سیاست کے بے نظیر مدبر، نظمِ مملکت کے بے مثل منتظم تھے ۔ ان کے تدبر کا لوہا مخالفین تک مانتے تھے اور حکومت کے جو انتظامی کام بڑے بڑوں سے نہ ہو سکے ان کو انھوں نے تنہا کرکے دکھا دیا ۔ ان کی زندگی ذاتی اغراض و فوائد کے داغ سے بالکل پاک تھی ۔ اپنے عہدہ سے کبھی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا ۔ ان کے پاس جو کچھ تھا دوسروں کے لئے وقف تھا ۔ جو ملا دوسروں پر صرف کر دیا اور خود ہمیشہ تہی دامن رہے اور عجب نہیں مقروض بھی رہے ہوں جس کی مثال آج بڑے عہدیداروں کی زندگی میں مشکل سے مل سکتی ہے ۔ ان کا سب سے بڑا وصف خدمتِ خلق، غریبوں کی امداد، دستگیری اور اہل حاجت کی حاجت روائی تھا ۔ ان کے دشمن تک ان سے فائدہ اٹھاتے تھے ۔ خدا ہی کو علم ہے کہ ان کی ذات سے کتنے غریبوں کی پرورش اور کتنے حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں اور اس اخفا کے ساتھ کہ کسی کو خبر تک نہ ہونے پاتی تھی ۔ دار المصنفین کے بھی وہ محسن تھے اور اس کے نازک دور میں انھوں نے خود بھی اس کی مدد کی اور دوسروں سے بھی امداد دلوائی ۔ وہ خدمتِ خلق کے لئے پیدا ہوئے تھے اور خدمت ہی کرتے کرتے دنیا سے اٹھے ۔" [۳۲]

---

۳۲ ۔ شذرات معارف نومبر ۱۹۵۴ء

④ معارف کی ادارتِ سوم کے شذرات و وفیات

۱- شذراتِ صباحی کا جائزہ

آج سے ۸۳ سال پہلے شبلی اکیڈمی دار المصنفین کے علمی و ادبی ماہنامہ 'معارف' کے اجرا کے وقت جب مولانا شبلی کے مایہ ناز شاگرد اور ان کے نام و کام کو زندگی و تابندگی دینے والے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے اس رسالہ کی ادارت کا قلم اپنے ہاتھ میں لیا اداریہ کا نام 'شذرات' تجویز کیا گیا۔ مالکِ لوح و قلم نے اس ماہنامہ کو قبولیت سے نوازا اور مقبولِ خاص و عام کیا۔ مولانا شبلی نے اسلامیات کا ربط ادبیات سے قائم کیا اور دین کو ادب کے قالب میں پیش کرنے کا رواج ڈالا۔ سید صاحب نے اس کو جلا دی اور ان کے شاگرد و جانشین شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس قلم کی آبرو رکھی۔ وقت نے بہت جلد اس بات کو ثابت کر دیا کہ سید صاحب کے ادارئیے کا ہر فقرہ دُرِ خالص کی آب اور سچے موتیوں کی تاب رکھتا ہے اور پھر جب شاہ معین الدین احمد ندوی کی زندگی کا چراغ اچانک گُل ہو گیا تو ان کے رفیقِ کار سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے آگے بڑھ کر اپنا لہو پیش کیا اور بحیثیت نقیبِ 'معارف' کی خدمت میں تن من دھن سے مصروفِ عمل ہو گئے۔

سید صباح الدین عبد الرحمٰن معارف کے بارِ امانت کو اٹھانے سے پہلے سے ملک کے دانش وروں اور اسلامیات پر تحقیق کرنے والوں میں اپنا ایک منفرد اور ممتاز مقام بنا چکے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی اور مولانا عبد السلام ندوی وغیرہ کی مجلسوں کے صحبت یافتہ ہونے کا شرف بھی رکھتے تھے لیکن ان کی شہرت ندوہ یا کسی معروف دینی درسگاہ سے فراغت کی نسبت نہیں تھی۔ اس لئے خیال ہوتا تھا کہ شاہ معین الدین احمد ندوی کے بعد معارف کو شاید ہی کوئی ایسا صاحبِ قلم مل سکے گا جس میں علامہ شبلی کا جاہ و جلال، ان کے جیسی فہم و فراست ہو،

سید سلیمان ندوی کی امانت علمیہ اور اس کا توازن ہو لیکن سید صباح الدین عبدالرحمن نے اپنے علمی اخلاص و محنت سے ثابت کردیا کہ ان میں 'حریفِ مے مرد افگنِ عشق' بننے کی چنگاری موجود تھی جو عرصے سے سلگ رہی تھی اور وقت آنے پر ایک شعلہ جوالہ بن کر سامنے آگئی۔

سید صباح الدین عبدالرحمن کی تحریر میں ایک طرف عشق کی گرمی، محبت کی دل آویزی اور اخلاص کی خوشبو تھی تو دوسری طرف صداقت کا نور، وسعت فکر کی ضوفشانی اور دبستان شبلی و سلیمانی کی چاندنی بھی تھی۔ سید صباح الدین عبدالرحمن کے شذرات طنز و تعریض سے پاک لیکن حق گوئی میں بیباک ہوتے تھے۔ ادعا و تعلّی کو ان کے مزاج سے مناسبت نہیں تھی۔ وہ دوسروں کا اعتراف فراخ دلی سے کرلیا کرتے تھے۔

ان کے قلم سے لکھے ہوئے شذرات کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ چونکہ تاریخ ان کا مخصوص مضمون تھا جس کی فنی باریکیوں سے وہ پوری طرح آگاہ تھے بلکہ نہایت عمدگی سے اس کی تکنیکی مہارت رکھتے تھے اس لیے ان کے شذرات میں عمومی طور پر تاریخ اور مورخانہ پیرایہ بیان اثر انداز رہا۔ ان کے بعض شذرات کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے بلکہ کئی کئی ماہ کے شذرات کو تسلسل سے دیکھیے ایسا محسوس ہوگا گویا سیر و تاریخ کی کسی دلچسپ کتاب کے مطالعہ میں منہمک و مستغرق ہیں یا کسی پسندیدہ تاریخی سیریل کو دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے معارف کے شذرات میں بعض ایسے سلسلہ وار مضامین بھی لکھے جو مستقل رسالہ یا پمفلٹ کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً چودھویں صدی ہجری کے اختتام اور پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کی مناسبت سے جو شذرات لکھے وہ دراصل گزشتہ صدیوں کی تاریخ کا مرقع اور مسلمانوں اور ان کی حکومتوں کے عروج و زوال کی داستان ہے۔ بابری مسجد کے تذکرہ کی داغ بیل

بھی معارف کے اسی دور کے شذرات میں پڑھی تھی۔ موصوف نے نہایت محنت، جانفشانی، تلاش اور تحقیق سے تمام واقعات و حقائق کو بے کم و کاست پیش کیا ہے لہٰذا ان کی تحریریں مختلف موضوعات و مباحث پر مستند، ثقہ اور معتبر علمی و تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تاریخی موضوعات پر ان کے شذرات کے مطالعہ کے نافع و کارآمد ہونے کے ثبوت میں مندرجہ ذیل عنوانات سے متعلق شذرات کے حوالے درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ تصوف اور صوفیاء — شذرات معارف ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۲۶۲

۲۔ مسلمان — ″ ″ جنوری ۱۹۷۸ء ص ۱۶۲

۳۔ مستشرقین یورپ کی ناپاک سازشیں اور جارحانہ ذہنیت
شذرات معارف اگست ۱۹۸۰ء ص ۸۶ + ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۲

۴۔ قدیم ہندوستان کے غدار — ″ ″ مارچ ۱۹۸۱ء ص ۱۶۲

۵۔ مسلمانوں کی گذشتہ ہزار سو سالہ تاریخ میں فرماں روائی کے اعلیٰ نمونے
شذرات معارف اپریل ۱۹۸۱ء ص ۲۴۲ تا جون ۱۹۸۱ء

۶۔ "پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں"
شذرات معارف اکتوبر ۱۹۸۱ء ص ۲۴۲

۷۔ مسلمانوں کے پیش نظر الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کا نصب العین
شذرات معارف دسمبر ۱۹۸۱ء ص ۴۰۲

۸۔ عہد ماضی میں مسلمانوں کی رواداری — ″ ″ جون ۱۹۸۳ء ص ۴۰۲

۹۔ بابری مسجد — ″ ″ فروری ۱۹۸۶ء تا جولائی ۱۹۸۶ء

۲- شذراتِ صباحی کے چند اقتباسات

۱- اپنی مادری زبان اردو کے موضوع پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

"اگر کوئی قوم یا فرقہ یا نسل اپنی مادری زبان کھو بیٹھتی ہے تو وہ جیتے جی ہلاک ہو جاتی ہے۔ اردو بولنے والے طلبا کے لئے اپنی مادری زبان نہ پڑھنا اور اس کے پڑھانے کی سہولتیں نہ فراہم کرنا نسل کشی ہے۔ طلبا اردو اس لئے بھی نہیں پڑھتے ہیں کہ سرکاری ملازمتوں میں یہ کام نہیں آتی۔ اگر زندگی کا مقصد صرف پیٹ پالنا ہو تو مادری زبان چھوڑی جا سکتی ہے، پھر اسی پیٹ کی خاطر دین بھی چھوڑنے میں تامل نہ ہوگا جس کے بعد تہذیبی، علمی اور مذہبی روایات کا وارث بن کر زندہ رہنے کا حق نہیں رہتا۔"

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی + جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اگر کوئی لسانی اقلیت اپنی زبان کو محفوظ رکھنے کا عزم بالجزم نہیں رکھتی تو حکومت کی چوکھٹ کی دریوزہ گری سے زندہ نہیں رکھی جا سکتی۔ وہ گلِ نغمہ یا پردہ ساز اپنے بل بوتے پر ہی بن سکتی ہے ورنہ اسے اپنی شکست کی آواز بن کر رہنا پڑے گا۔ ہر ملک کی اکثریت اقلیت سے اپنی ہر چیز کو تسلیم کرانے کے حق کو استعمال کرنے میں گریز نہیں کرتی۔ یہ اس کا فطری تقاضہ ہوتا ہے اس لئے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر جارحانہ رنگ بھی اختیار کرتی رہتی ہے۔ مگر اقلیت کا بھی یہ فطری حق ہے کہ وہ اپنی ہر چیز کو برقرار رکھنے کے لئے پوری مدافعت کرے جو مختلف صورتوں سے ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اس جارحیت اور مدافعت کے ٹکراؤ میں اگر مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے تو جارحیت غالب آ جاتی ہے اور اگر مدافعت کی قوت بڑھتی جاتی ہے تو جارحیت کو مدافعت کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ جھکنے اور جھکانے کا کھیل ہر زمانہ میں ہوتا رہتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو ہندی کے سامنے جھک کر رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے یا اپنی فطری قوت کو

سے باقی رہتی ہے۔ اس کے حامیوں کو حکومت پر فقط الزام تراشی کرنے کی بجائے اپنی کوتاہ اندیشی اور سہل پسندی، حیلہ جوئی اور بے عملی کا بھی جائزہ لینا ہے۔ شکست خوردگی اور گریز پائی کی ریت کے اندر سر چھپا کر آندھی کے گزر جانے کا انتظار کرنا، زندگی کی حقیقت کا سامنا کرنے کے بجائے اس سے منہ موڑنا ہے۔

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا + دیکھو وگرنہ حشر نہ ہوگا پھر کبھی

مگر خود اردو اپنے آپ سے زیادہ مایوس نہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک ہندوستان میں اردو میں اب تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ہندی کے علاوہ اور کسی علاقائی زبان میں شاید ہی ہوئی ہیں۔ مہاراشٹر، بہار، آندھرا پردیش اور کرناٹک میں اردو بولنے والے طلبار اسی زبان میں ثانوی تعلیم پا رہے ہیں۔ تیج، ملاپ، پرتاپ اور شیر پنجاب وغیرہ جیسے اخبارات کی اشاعت سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ اردو ابھی تک غیر مسلموں میں بھی مقبول ہے۔ پاکستان میں اردو اخبارات کی تعداد و اشاعت وہاں کے انگریزی اخباروں سے زیادہ ہے۔ اب تو لندن سے بھی اردو اخبارات شائع ہونے لگے ہیں۔ دنیا کے تمام اہم ملکوں کے ریڈیو اسٹیشنوں سے اردو میں خبریں اور دلچسپ پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے بھی قائم کیے گئے ہیں۔ بیرونی ممالک میں اس کی قدر و منزلت اتر پردیش کے ان اردو بولنے والوں کے لیے باعث عبرت و غیرت ہے جو غزل کو اردو رسم الخط میں نہیں لکھ پاتے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ غزل اب گجل ہو رہی ہے، اس کا عشق 'اسک' اور اس کا معشوق 'ماسوک' ہو رہا ہے۔ عاشق کا سوز دل 'سوج دل' اور معشوق کا ظلم 'جولم' اور اس کی زلف 'جلف' بنتی جا رہی ہے۔ یہ انقلاب انیس، دبیر، ناسخ، آتش، نسیم، سرشار، چکبست اور شبلی کی سرزمین میں آ رہا ہے ع

محمل جو گیا عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی، لیلیٰ بھی گئی۔" [۳۳]

۲۔ ملکی مسائل کی نفسیاتی تجزیہ نگاری کے ضمن میں سید صباح الدین عبدالرحمن

---

[۳۳] شذرات معارف مارچ ۱۹۷۵ء

ایک جگہ رقم طراز ہیں :

" ایک عام مسلمان ملک میں عام طور پر ہونے والے فسادات سے اب زیادہ نہیں گھبراتا ہے ۔ وہ سمجھنے لگا ہے کہ کائنات کے عناصر اربعہ کی طرح وطن کے بہت سے عناصر ہیں ۔ ایک عنصر بلوہ فساد بھی سہی ۔ اس سرزمین کے سانپ اور بچھو کی طرح یہ بلوائی اور فسادی بھی ہیں ۔ جس طرح یہاں کے سانپ اور بچھو ان کی روزمرہ زندگی کو ختم نہیں کر سکے اسی طرح یہ دشمن وطن ان کی اجتماعی حیات کو برباد نہیں کر سکے ۔

مگر تمام مسلمان اس اعصابی جنگ سے خوف، سراسیمہ اور پریشان ہیں جو ان کو صحافت کی جارحانہ نگاریوں، سیاسی لیڈروں کی شیوہ بیانیوں، وطنیت اور قومیت کے خود ساختہ جارحانہ نظریوں، سرکاری نظام کی کاوش نگاہوں اور پولس کی ستم آرائیوں کے ذریعے سے یہ احساس دلایا جا رہا ہے کہ وہ یہ سمجھیں کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے، یہاں ان ہی کا مذہب ہوگا، ان ہی کا مندر ہوگا، ان ہی کا طرز زندگی ہوگا، ان ہی کا کلچر ہوگا، سیکولرزم کی آڑ میں ان ہی کا تصور ریاست ہوگا اور ان ہی کا ملکی قانون ہوگا ۔ جو شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کو تسلیم نہیں کرتے ان کو یہاں رہنے کا حق نہیں ۔ اگر کسی سیاسی رہنما کی مصلحت کوشی اور شیریں بیانی یا کسی اخبار کے کالم نگار کے قلم کی زور آوری اور مغالطہ انگیزی یا جلسے جلوس کے ہجوم کی ہنگامہ آرائی اور نعرہ بازی سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے کہ مسلمانوں کا یہ احساس وہمی اور غیر حقیقی ہے تو وہ حق ناشناس بن کر ایک حقیقت پر پردہ ڈال کر اور ملک کے جسم کے ناسور کو ناسور نہ سمجھ کر وطن دوستی کے بجائے وطن دشمنی کا ثبوت دیتا ہے ۔ ہمارے ملک کی ماضی کی تاریخ بڑی لمبی ہے ۔ گذشتہ دور میں کوتاہ نظری، کج فہمی اور عدم رواداری کی بے خبری اور ناعاقبت اندیشی سے اس کو جو نقصانات پہونچتے رہے ہیں ان کا کھلے ذہن کے ساتھ برابر تجزیہ کرتے رہنے ہی میں ملک کی اصلی ہوا خواہی، دوستی اور محبت ہے ۔ " [۳۴]

---

[۳۴] شذرات معارف اکتوبر ۱۹۸۷ء

۳۔ وفیاتِ صباحی کا جائزہ

شاہ معین الدین احمد ندوی کا انتقال ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء کو ہوا جبکہ سید صباح الدین عبدالرحمن سڑک کے حادثہ میں ۱۸ نومبر ۱۹۸۷ء کو جاں بحق ہوئے۔ اس طرح سید صباح الدین کی نظامت اور ادارت کا زمانہ باقاعدگی سے ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۷ء تک ٹھیک ٹھیک ۱۳ برس پر محیط ہے۔ اس سے قبل دارالمصنفین اور معارف کے ضمن میں ان کی تمام سرگرمیاں شاہ معین الدین ندوی کے کارگزار معاون کی حیثیت سے ہیں۔ سید صباح الدین کی نظامت و ادارت کے اوائل دور میں مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کا ورود مسعود بھی دارالمصنفین میں ہوا اور انہوں نے بھی معارف کے معاون مدیر کی حیثیت سے ٹھیک ٹھیک ۵ برس (۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۹ء تک) کام کیا اور ان کا نام بھی معاون مدیر کی حیثیت سے معارف کے سرورق پر چھپتا رہا۔ اور سید صباح الدین عبدالرحمن کی تحریروں میں خاص طور پر شذرات اور وفیات کبھی اتفاقی ضرورت سے اور کبھی تسلسل کے ساتھ لکھتے رہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمن کے تقریباً ۱۳ سالہ دورِ نظامت و ادارت میں معارف کے شماروں کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد ہوتی ہے اور معارف کے اجراء سے لیکر شاہ صاحب کے انتقال تک کا دورانیہ تو عرصہ نصف صدی سے زائد یعنی 58 برس ہے جو ایک بڑا اور نمایاں Generation Gap ہے اور افکار و اسلوب کی دنیا میں حد فاصل کو قائم کرنے والا ہے لیکن سلسلہ روایت چونکہ شروع ہی سے احساسات اور تجربات مشترک لیے آرہے تھے اس لیے اس اشتراک نے وہ سارے فاصلے مٹا دئے جو ان کی نسل اور ان کے نامور اکابر کی نسلوں کے درمیان ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تحریر اور نگارش اپنے دور کی ترجمان رہتے ہوئے بھی اور اپنے طرز و طرح کی خصوصیات کی حامل ہوتے ہوئے بھی سابقہ ادوار سے غیر منسلک اور ناآشنا نظر نہیں آتی۔ جس طرح انھوں نے شذرات کو نئے برگ و بار عطا کئے، وفیات کے کالم اور باب کو بھی نیا آہنگ بخشا چنانچہ ان کے یہاں تاثرات اور احساسات میں وہی لے، وہی ساز، وہی درد اور وہی انداز دکھائی پڑتا ہے جو معارف کے سابقہ اداریہ نگاروں کی تحریر کا خاصہ رہی ہے۔

مندرجہ ذیل سطور میں ان چند اہم سوگ ناموں کی فہرست پیش کی جاتی ہے جو سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے دور نظامت و ادارت میں شذرات معارف کے کالم میں یا علیحدہ وفیات کے عنوان سے مشاہیر کی اموات پر لکھے گئے:

علماء و مشائخ: ——————

مولانا محمد شاہد فاخری — خانوادہ دائرہ شاہ اجمل الہ آباد کی ممتاز شخصیت — اکتوبر ۱۹۷۵ء

مولانا محمد میاں — نومبر ۱۹۷۵ء

مولانا سید فضل اللہ — جون ۱۹۷۶ء

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی — متوفی ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء — اکتوبر ۱۹۷۹ء

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارن پوری — جون ۱۹۸۱ء

قاری محمد طیب — سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، جید عالم دین — متوفی ۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء — اگست ۱۹۸۳ء

مفتی عتیق الرحمٰن — متوفی ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء — جون ۱۹۸۴ء

مولانا محمد عمران خاں ندوی — متوفی ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۶ء — نومبر ۱۹۸۶ء

مولانا محمد یوسف بنوری — نومبر ۱۹۷۷ء

شعرائے کرام: ——————

جوش ملیح آبادی
فراق گورکھپوری
احسان دانش
کنور داحدی
} فروری ۱۹۸۲ء

سکندر علی وجد — جولائی ۱۹۸۳ء

مشاہیر عالم :

شاہ فیصل متوفی ۲۴ مارچ ۱۹۷۵ء — اپریل ۱۹۷۵ء

ڈاکٹر رادھا کرشنن — مئی ″

ڈاکٹر ذاکر حسین متوفی ۳ مئی ۱۹۶۹ء — مئی ۱۹۶۹ء

فخرالدین علی احمد — فروری ۱۹۷۷ء

شریمتی اندرا گاندھی — نومبر ۱۹۸۴ء

مشاہیر صوبہ بہار :

مولانا سید فضل اللہ — جون ۱۹۷۹ء

مولانا سید محمد محیی شاہ پھلواروی — اپریل ۱۹۸۲ء

(بزرگ، عالم، واعظ، کتابوں کے مصنف، لاہور کے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ شاہ سلیمان پھلواروی کے فرزند ارجمند)

شاہ امان اللہ پھلواری سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف — جون ۱۹۸۵ء

شاہ قمر عالم بھاگلپوری سجادہ نشین خانقاہ کنریا بابا بھاگلپور — جون ۱۹۷۶ء

صاحبان زبان و ادب :

ڈاکٹر اعجاز حسین سابق صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی }
ڈاکٹر مسیح الزماں ریڈر شعبہ اردو ″ } — مارچ ۱۹۷۵ء

مولانا امتیاز علی خان عرشی رامپوری — مارچ ۱۹۸۱ء

مولانا عبدالباری ندوی نامور مصنف، مترجم، اہل قلم — فروری ۱۹۷۶ء

مولانا محمد ثانی حسنی خواہر زادہ مولانا ابوالحسن علی ندوی — فروری ۱۹۸۲ء

پروفیسر کلیم الدین احمد }
قاضی عبدالودود } — فروری ۱۹۸۳ء

ارباب صحافت : ——

مولانا محمد عثمان فارقلیط	سابق مدیر روزنامہ الجمعیۃ ، رکن خاص مجلۃ الفکار	جولائی ۱۹۷۶ء
مولانا محمد الحسنی	مدیر البعث الاسلامی ندوۃ العلماء	جولائی ۱۹۷۹ء
مولانا محمد مسلم	سابق ایڈیٹر روزنامہ دعوت	ستمبر ۱۹۸۶ء

ارباب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ : ——

مولانا سعید احمد اکبرآبادی	سابق صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ متوفی ۱۲ر مئی ۱۹۸۵ء	جولائی ۱۹۸۵ء
ڈاکٹر عبدالعلیم	سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	مارچ ۱۹۷۶ء
پروفیسر رشید احمد صدیقی		فروری ۱۹۷۷ء
ڈاکٹر یوسف حسین خاں	سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نامور مصنف اور اہل قلم ، برادر ڈاکٹر ذاکر حسین متوفی ۲۱ر فروری ۱۹۷۹ء	اپریل ۱۹۷۹ء
نواب چھتاری (حافظ محمد سعید خاں آف چھتاری)	سابق چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	جنوری ۱۹۸۲ء
ڈاکٹر عابد حسین	اردو کے مایہ ناز ادیب ، مترجم ، بلند پایہ مصنف ، محتاط اہل قلم ، کئی رسالوں کے مدیر	دسمبر ۱۹۷۸ء
پروفیسر محمد مجیب	سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ	فروری ۱۹۸۵ء

مشاہیر پاکستان : ——

شورش کاشمیری		نومبر ۱۹۷۵ء
بشیر احمد ڈار		جون ۱۹۷۹ء
میاں محمد طفیل	ایڈیٹر نقوش	ستمبر ۱۹۸۶ء
قدرت اللہ شہاب	پرانے I.C.S. جو پاکستان کے اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے -	〃
ڈاکٹر سید عبداللہ		〃
سید حسام الدین راشدی	دارالمصنفین کے بڑے قدردان اور صاحب قلم جن کی توجہ خاص اور کوششوں سے دارالمصنفین کو اس کی پاکستانی مطبوعات کے حق طباعت واشاعت کا معاوضہ ۱۵ لاکھ روپئے ملا تھا -	اپریل ۱۹۸۲ء

وابستگانِ دارالمصنفین : ——

شاہ معین الدین احمد ندوی	متوفی ۱۳؍دسمبر ۱۹۷۴ء	جنوری ۱۹۷۵ء
مولانا عبدالسلام قدوائی		ستمبر ۱۹۷۹ء
مولانا عبدالماجد دریابادی		جنوری ۱۹۷۷ء
مولانا محمد اویس ندوی نگرامی		ستمبر ۱۹۷۶ء
مولانا ریاست علی ندوی		دسمبر ۱۹۷۶ء
سعید انصاری		مارچ ۱۹۸۴ء
اہلیہ محترمہ سید سلیمان ندوی	متوفی ۳؍جولائی ۱۹۷۸ء	اگست ۱۹۸۷ء

۴- وفیاتِ صباحی کے چند اقتباسات

۱- سعودی عرب کے حکمران شاہ فیصل کی شہادت پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن معارف کے شذرات میں اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں :

" مدتوں کے بعد بڑی مشکل سے اسلامی دنیا میں ایک دیدہ ور پیدا ہوا جس کے مقاصد جلیل تھے ، جس کی ادائیں دلفریب اور نگاہیں دلنواز تھیں - اسلام کے اس لطلِ حریت نے صرف ۱۱ سال حکومت کی مگر اس کے سارے کارنامے اسلامی تاریخ کے زریں باب بن کر رہیں گے - سعودی عرب کو دنیا کے متمول ترین ملکوں کی صف میں لا کھڑا کیا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو بیج دھج کر فردوس نگاہ بنا دیا - پٹرول کو جنگی اسلحہ سے زیادہ مہلک تسلیم کر کے دنیا کی اہم طاقتوں کو بھی اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کیا - حاتم طائی کی افسانوی سخاوت کی شہرت کو ماند کر کے عربوں کو اپنے مالی امداد سے سربلند اور سرخرو کیا - پچھڑے ہوئے مسلمان ملکوں کی دستگیری کر کے ان کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دلایا - اسلامی بینک ، اسلامی سکریٹریٹ اسلامی خبر رساں ایجنسی اور اسلامی سربراہ کانفرنس کی روح رواں بن کر یہ خاموش پیام دیا کہ توحید کی امانت سینے میں رکھنے والے اخوت کا بیان اور محبت کی زبان بن کر دہر کو اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دیں " - ۳۵

۲- ڈاکٹر رادھا کرشنن سابق صدر جمہوریہ ہند کی موت پر سید صباح الدین حسب ذیل لہجے میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں :

" وہ ہندو مذہب کے بہت بڑے شارح تھے - فلسفہ میں بھی ان کا علم بہت گہرا تھا اس لئے ہندو مذہب کے عقائد و تفکرات میں فلسفیانہ موشگافی کرتے رہے - افلاطون فلسفی حکمران کو پسند کرتا تھا ، ڈاکٹر رادھا کرشنن افلاطون کے سیاسی خواب کی تعبیر تھے - بلند پایہ فلسفی

---

۳۵ شذرات معارف اپریل ۱۹۷۵ء

مخلص محب وطن اور مدبر ہونے کے ساتھ مذہب کو اپنی زندگی کی بیساکھی بنانے میں شرمندگی محسوس نہیں کی۔ 'ظاہری وضع قطع بہت مذہبی معلوم ہوتے، تسبیح بھی لگاتے، تقریروں میں بلا تکلف وید کے اشلوکوں کے حوالے بھی دیتے رہتے۔ ان کی زندگی یہ پیام چھوڑ گئی کہ مذہب سیاست میں مشکلیں پیدا نہیں کرتا بلکہ اس سے سیاست میں روحانیت اور حقانیت پیدا ہوجاتی ہے۔ البتہ مذہب میں سیاست لائی جاتی ہے تو مذہب اور سیاست دونوں میں ریاکاری اور عیاری آجاتی ہے'۔ ۳۶

۳۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، برادر حقیقی ڈاکٹر ذاکر حسین اور علم و تحقیق کی دنیا میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والی شخصیت کی موت پر سید صباح الدین رقم طراز ہیں:

"ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم کے وقار کو کسی موقع پر جھکنے نہیں دیا، وقار خود ان کے آگے جھکا۔ ان کو پانچ ہزار کا ایوارڈ بھی ملا مگر ان کے بیش بہا علم کی قیمت لگائی نہیں جاسکتی، ان کو پدم وبھوشن کا اعزاز بھی ملا مگر خود اس اعزاز کو ان سے عزت حاصل ہوئی۔ ان کی وفات پر خیال تھا کہ علمی حلقوں میں بڑا ماتم ہوگا۔ آج کل خاص خاص حلقے ایسے بنے ہوئے ہیں جہاں کی نرگس ہزاروں سال رونے کی بجائے صرف ایک دو سال رو کر اپنے ہی کے دیدہ ور کو دیکھ لیتی ہے۔ ایسے حلقے کی نرگس اپنی بے نوری کی وجہ سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی دیدہ وری کو صحیح طور پر دیکھ نہیں سکی اس لئے ان کا یہاں ماتم نہ ہوا تو تعجب کرنے کی بات نہیں۔ مگر جو اپنی نظروں میں نور رکھتے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے علم کی طہارت، بصیرت، ان کی رائے کی اصابت، پھر ان کے ادبی ذوق کی پاکیزگی، قلم کی رعنائی، تنقید نگاری کی دل آویزی اور گہرائی کو یاد کریں گے اور اکثر یاد کرکے اپنے ذوق ادب اور علم و تحقیق میں نفاست، لطافت اور طاقت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔" ۳۷

۴۔ اردو کے عظیم شاعر احسان دانش کی موت پر قدردانی اور حقیقت بیانی کا ادبی و اسلامی حق ادا کرنے میں عمدہ نکتہ آفرینی کا ثبوت دیتے ہیں:

---

۳۶ شذرات معارف مئی ۱۹۷۵ء ۳۷ شذرات معارف اپریل ۱۹۷۹ء

"ان کی رحلت سے اردو شعر و ادب کے قصر کی رنگا رنگی میں بڑی کمی پیدا ہوگئی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی ایک پریشان حال مزدور کی حیثیت سے شروع کی لیکن اپنی وفات سے پہلے اردو شاعری کے ایک تاجدار تسلیم کرلیے گئے تھے۔ مشاعرے کے اسٹیج پر آتے تو ان کے چہرہ سے ان کی زندگی کی سادگی اور پریشانی ظاہر ہوتی مگر کلام سناتے تو ان کے خیالات کی پرکاری اور رعنائی سے سامعین متاثر ہوکر محسوس کرتے کہ وہ اپنی شاعری میں جادۂ نو پر چل رہے ہیں۔ غزلیں سناتے تو تغزل کا چراغاں کرکے درد زندگی کے راز پنہاں کو عیاں کرتے۔ ان کی زندگی زیادہ تر پریشانیوں میں گزری مگر وہ آتش خاموش[38] بن کر ایک شاعر کا حق ادا کرتے رہے۔ اسی لئے ان کی سخن وری نوائے کارگر[39] اور حدیث ادب[40] بنی رہی۔ ان کے مشق سخن کی کہانی ان ہی کی زبانی یہ ہے کہ جب ان پر جذبۂ شاعری طاری ہوتا تو وہ اپنی روح میں التہاب پاتے اور جب شعر سپرد قلم کرتے تو محسوس کرتے کہ الفاظ میں، کاتب تقدیر دائروں، نقطوں، مرکزوں اور پیوندوں کے نیچے ان کی روح دبتی چلی جارہی ہے اور جب کوئی نظم پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی تو اپنی روح کو سبک اور آرام طلب پاتے، پھر وہ میٹھی نیند سوجاتے۔

وہ اردو کے نظم گویوں کی صف اول میں آگئے تھے۔ تصویر خیالی ہو، نیرنگ تصور ہو، حسن نظر ہو، اثرات رباب ہو، سب میں ان کی نظم گوئی کی جلوہ طرازیاں ہیں۔

وہ مزدوروں کے شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے۔ فاقہ کشی کے الم پرور مناظر، سرمایہ داری کے خونچکاں مرقعے اور پامال انسانیت کے درد انگیز خاکے بڑے موثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ محض جگ بیتی نہیں تھی بلکہ آپ بیتی بھی تھی۔ مگر وہ کسی لمحہ بھی اشتراکی نہیں ہوئے۔ راسخ العقیدہ مسلمان رہ کر اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ ان کی یہی راسخ العقیدگی آخرت میں زاد راہ ہوگی۔"[41]

۵ - اردو کے عظیم شاعر نشور واحدی کی موت پر سید صباح الدین چند سطروں میں خاکہ نگاری کا حق ادا کرتے ہیں:

"متین، سنجیدہ اور پرانی تہذیب کے حامل تھے۔ فکر و نظر کے رنگ و آہنگ کی جلوہ گری میں اپنے معاصرین سے کم نہیں نظر آتے بلکہ بعض حیثیتوں سے قد آور دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تغزل کی رنگینیاں بھی ہیں، قوم و وطن کے لئے پیام زندگی بھی اور خوش فکری و سرمستی کے نغمے بھی ہیں۔ اپنی ان شاعرانہ خوبیوں کو انھوں نے آخر وقت تک قائم رکھا۔"[42]

---

[38] تا [40] احسان دانش کے مجموعوں کے نام ہیں جو ادب شناسی اور تشبیہ نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔

[41] شذرات معارف فروری ۱۹۸۲ء [42] شذرات معارف فروری ۱۹۸۳ء

۶۔ اہلیہ سید سلیمان ندوی کی موت پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے معارف کے شذرات میں اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار فرمایا ہے:

"یہ تعزیتی تحریر دارالمصنفین کے احاطہ میں اس گھر میں لکھی جا رہی ہے جہاں حضرت استاذی المحترم نے اپنی زندگی کے بہترین بلکہ بہار آفریں اور مشک آگیں دور گزارے ہیں۔ وہ یہاں کے کتب خانہ میں اپنی میز پر سیرت النبی، معارف کے شذرات اور علمی و ادبی مضامین میں اپنے علم و عرفان کے مروارید، نظر و فکر کے زمرد اور ادب و انشاء کے درِ شاہوار بکھیر کر اس گھر میں داخل ہوتے تو پہلے اپنی سب سے چھوٹی اولاد کو اپنی آغوشِ شفقت میں لیتے، پھر ان کی اور اولادیں ان کے یمین و یسار میں بیٹھ جاتیں۔ جس کے لیے علمی میز پر ان کو جو تکان ہوتی وہ یکایک دور ہو جاتی اور ان کے چہرے پر بشاشت، ان کی ہر ادا میں نزہت اور ان کی بزرگی میں روحانیت دکھائی دیتی۔ وہ اپنے بچوں کے شگفتہ چہروں کو دیکھتے تو ان کی آنکھیں جنت نگاہ بن جاتیں، ان کی معصوم باتوں کو سنتے تو ان کے کان فردوس گوش بن جاتے، پھر فضا میں پدری مہر و محبت کی کوثر و سلسبیل بہتی نظر آتیں۔ اسی فضا میں ان کی اہلیہ محترمہ نے بھی زندگی گزاری۔ اس گھر میں وہ تقریباً ۱۹ برس رہیں۔

سید صاحب اپنی گھریلو زندگی میں بہت ہی نفاست پسند تھے۔ ان کی ہر چیز بہت سلیقہ، صفائی اور ستھرائی سے رکھی رہتی۔ مرحومہ بھی فطری طور پر بہت ہی سلیقہ مند، مہذب، عبادت گزار اور باوقار تھیں جس سے سید صاحب کو اپنی زندگی گزارنے میں بڑی مدد ملتی رہتی۔ دارالمصنفین کی قلیل آمدنی میں دونوں کی زندگی نہ صرف صاف ستھری بلکہ لطف و سرور سے معمور رہی۔ وہ سید صاحب کے ساتھ بھوپال بھی گئیں، پھر کراچی منتقل ہو گئیں لیکن آخر وقت تک فرماتی رہیں کہ جو مسرت اور انبساط بھری زندگی دارالمصنفین میں گزری وہ کہیں اور نہیں ملی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو چار بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا۔ سید صاحب کی پہلی اہلیہ مرحومہ سے ایک بیٹے عزیزی ابو سہیل خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ مرحومہ اپنی محبت بھری وضعداری میں جب کبھی کوئی خط لکھتیں تو آخر میں والدہ ابو سہیل ہی لکھ کر اس کو ختم کرتیں۔ ان کے فرزند ارجمند عزیزی ڈاکٹر سلمان ندوی نے اپنا نام علمی دنیا میں اونچا کیا ہے لیکن وہ اپنی عالی ظرفی میں والدہ سلمان لکھنے کے بجائے زیادہ تر والدہ ابو سہیل ہی لکھنا پسند کرتیں۔

وہ اپنی تمام اولاد کو اپنی زندگی میں آباد اور خوش و خرم دیکھ کر اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ اپنے نواسے نواسیوں، پوتے اور پوتی کی زندگی کی بہاریں بھی دیکھیں۔ ایک خوش نصیب ماں کی حیثیت سے اس دار فانی سے رخصت ہوئیں۔ البتہ اپنے نامور اور ہر دل عزیز شوہر کی وفات کے بعد تقریباً ۳۴ سال بیوگی کی زندگی گزاری مگر ان کی یادوں کی جوت جگا کر ہر طرح شاکر اور مطمئن رہنے کی کوشش کی۔ ہمیشہ قناعت، توکل، صبر اور رضا کو اپنی نسوانی زندگی کا زیور اور ہنسی خوشی کے موتیوں کو اپنے گلے کا ہار بنا کر بچوں کے ساتھ زندگی گزاردی۔

وہ وہاں جا چکیں جہاں ایک روز سب کو جانا ہے۔ اپنے جلیل القدر شوہر کی ناموس اور عظمت کو اپنی بیوگی میں جس زہد و عبادت میں برقرار رکھا، پھر جس سے ملیں اس کو اپنی بزرگانہ محبت سے جس طرح سرشار کیا اور اپنے پیچھے اپنے آن بان کی جو روایتیں چھوڑ گئی ہیں ان کی یادوں کی شمع روشن کرکے ان کی اولاد ان کی خوبیوں کے جلووں سے اپنی خلوتیں آباد کرتی رہے گی۔ ہر سمت ان کی یاد کی بے کلی حزن آگین ہی رہے گی۔ حضرت سید صاحب کے سایۂ عاطفت اور مرحومہ کی شفقت مادری کے جلو میں دارالمصنفین کے احاطہ کی زندگی میں جو کشش، یہاں کی سحر میں جو دلکشی، یہاں کی شام میں جو دل فریبی اور یہاں کی رات میں جو دل افروزی پائی ان کی یادوں کے غم کو آغوش میں لے کر چشم اشک آگیں کے ساتھ بقیہ زندگی گزرے گی۔" [۳۴]

---

[۳۴] شذرات معارف اگست ۱۹۸۷ء

۵ معارف کی ادارت چہارم کے شذرات و وفیات

۱۔ شذرات اصلاحی کا جائزہ

سید صباح الدین عبدالرحمن نومبر ۱۹۸۷ کے شذرات اپنے قلم سے لکھ کر بلکہ مکمل معارف خود سے مرتب کر کے ۱۰ نومبر کو اعظم گڑھ سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ ۱۸ نومبر کو غیر متوقع طور پر موٹر کے ایک حادثہ میں وہ وفات پا گئے۔ مذکورہ تاریخ تک معارف کی کتابت مکمل ہو چکی تھی اور اس کا زیادہ حصہ چھپ بھی گیا تھا چنانچہ نومبر ۱۹۸۷ء کے معارف میں ادارہ دارالمصنفین کی طرف سے دو صفحات پر مشتمل ایک تعزیتی نوٹ 'حادثۂ جانکاہ' کے عنوان سے رسالہ کے شروع میں شائع کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۸۷ کے معارف کے سرورق پر حسب دستور مرتب کی حیثیت سے کسی کے نام کا اندراج نہیں ملتا ہے البتہ دسمبر ۱۹۸۸ء کا شذرات از اول تا آخر سابق ناظم دارالمصنفین و مدیر معارف سید صباح الدین عبدالرحمن کی وفات حسرت آیات پر مفصل سوگ نامہ ہے۔

جبکہ جنوری ۱۹۸۸ء کے معارف کے سرورق پر مرتب کا نام ضیاءالدین اصلاحی مندرج ہے۔ اس شمارہ کے شذرات میں مولانا ضیاءالدین اصلاحی نے سید صباح الدین عبدالرحمن کے حادثہ سے پیدا شدہ صورت حال پر تبصرہ کیا ہے اور مذکورہ حالات کے تناظر میں قائم مقام ناظم دارالمصنفین اور مدیر معارف کی حیثیت سے مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنی تقرری کا اعلان بھی کیا ہے:

"..... دارالمصنفین کے نظم و نسق کے متعلق مفید اور اہم فیصلے کئے گئے اور اس کے نئے نظام پر بھی غور و خوض ہوا۔ اس کے تحت اس عاجز کو شعبہ علمی کی نظامت اور سید شہاب الدین دسنوی کو انتظامی امور کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔

ڈاکٹر محمد منظم جیراج پوری مجلس انتظامیہ کے اور مولانا ابوالعرفان ندوی معارف کی مجلس ادارت کے نئے رکن منتخب ہوئے۔ ...... ان سب حضرات کا انتخاب مناسب اور حق بہ حقدار رسید کے مصداق ہے مگر یہ عاجز کسی حیثیت سے اس منصب کا اہل نہ تھا اس لئے اس کے انتخاب کو کبریٰ موت الکبراد کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے

...... راقم کو اپنی نااہلی کے احساس کے باوجود الامر فوق الادب کے بموجب اور دارالمصنفین کے مفاد و مصالح کے پیش نظر اس ذمہ داری کو قبول کرنا پڑا۔"

یہ بات صحیح ہے کہ اکابر چھوٹوں کو بڑا بنا دیتے ہیں بلکہ ان کے کوتاہ قد کو بلند قامتی میں بدل ڈالنے کا محرک بن جاتی ہے۔ اس بات کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ کسی منصب عظمیٰ کا بوجھ غیر متوقع شخصیات کو بھی اہل و باصلاحیت بنا دیتا ہے —— اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساڑھے گیارہ برس کا طویل عرصہ گزر گیا۔ چونکہ موصوف شروع سے ایک اولوالعزم حوصلہ مند اور فعال شخص تھے ان کے عزم مصمم اور سعی پیہم کے پیش نظر دشوار مراحل طے ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے اپنے نامور اسلاف کی روش پر چل کر شذرات کے نکھار اور معیار کو سابقہ خطوط پر برقرار رکھا۔ اور شذرات کے سنہری اوراق ان کی ادبی و صحافتی سرگرمیوں کی جولان گاہ بن گئے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی نظامت اور ادارت کی مدت جنوری ۱۹۸۸ء سے جون 1999 تک مکمل $11\frac{1}{2}$ برس ہو جاتی ہے۔

ع دائم شگفتہ باد ترا گلستان عمر (طالب آملی)

خدا تعالیٰ انھیں زیادہ سے زیادہ صحت و شادمانی کی دولت سے نوازے اور حسن عمل و حسن کارکردگی سے نوازے (آمین)

۲- شذراتِ اصلاحی کے چند اقتباسات

۱- مشرقی و مغربی نظامِ تعلیم کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے اور مغربی نظامِ تعلیم کے معائب کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا ضیاءالدین اصلاحی رقمطراز ہیں:

"مولانا سید سلیمان ندوی نے مغرب کے بعض مفکرین اور ماہرینِ تعلیم کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ ان کے نزدیک نظامِ تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی گزارنے میں زیادہ سے زیادہ مدد مل سکے یا نوعِ انسانی کے لئے اجتماعی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل ہو سکیں یا اس کی آخری غایت محض اس قدر ہے کہ انسان کو مادی قوانین کا صحیح ترین علم ہو سکے۔ مغربی نظامِ تعلیم میں بداخلاقی بالواسطہ صرف اس حیثیت سے مذموم ہے کہ بالآخر اس کے نتائج اس کے مرتکب کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوں گے۔ اس لحاظ سے معیوب نہیں ہے کہ وہ بجائے خود کوئی قابلِ مواخذہ شے ہے۔ سید صاحب نے کرۂ ارض کے دوسرے حصوں میں ایک ایسے نظامِ تعلیم کا ذکر کیا ہے جس میں علم حصول کی غایت تمامتر خداشناسی، تزکیۂ نفس و توفیقِ حسنِ عمل ہے اور اس کا آخری مقصد نجاتِ اخروی ہے نہ کہ بیش قرار مشاہرہ کا حصول۔ لیکن جس نظامِ تعلیم کی غایت خداشناسی ہو اس میں طالبِ علم کا مقصد رضائے الٰہی، حیاتِ اخروی، رفعِ جہالتِ نفس اور خدمتِ خلق ہوتا ہے۔ اس لئے وہ لامحالہ پاکیزہ نفسی، حسنِ سیرت و کردار، طہارتِ قلب و نظر اور صفائی فکر و عمل کا مظہر ہوگا۔ یہاں جو جس قدر علم میں فائق ہوگا اس میں اسی قدر احتیاط اور ذمہ داری ہوگی۔ لوگوں کی خدمت و خیر خواہی اور قوم و وطن کی فلاح و بہبود کے سوا اس کا کوئی مطمحِ نظر نہ ہوگا۔ مگر یہ پاکیزہ نظامِ تعلیم اب خواب و خیال ہو رہا ہے اور یورپ و امریکہ کی سیاسی بالادستی کی وجہ سے وہ نظامِ تعلیم دنیا پر مسلط ہو رہا ہے جو خدا ناشناسی کی بنا پر مفاسد و معائب کا سرچشمہ ہے۔ اس کا اندازہ محض اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یورپ میں تعلیم عام ہونے کے باوجود اخلاقی خرابیوں اور جرائم کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان میں علمی و تعلیمی حیثیت سے پسماندگی کے باوجود مغرب کی بہ نسبت جرائم کا تناسب کم ہے۔" [1]

۲- دہلی ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ کی روشنی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اقلیتی کردار کو ختم کرنے کی سرکاری کوشش پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ضیاءالدین اصلاحی فرماتے ہیں:

"۱۹۸۸ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو سنٹرل یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا تو اس کے اربابِ حل و عقد

---

[1] شذرات معارف مارچ ۱۹۹۷ء

یونیورسٹی بانے کی خوشی میں یہ نہ سمجھے کہ یہی اس کے اقلیتی کردار کو سلب کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے زیر اثر گاندھی جی کی اس اپیل پر جامعہ کا قیام عمل میں آیا تھا کہ برطانوی تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ چنانچہ مولانا محمد علی کی قیادت میں ایم اے او کالج کے طلبہ نے وہاں تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد کالج کی مسجد میں جمعہ کے دن ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ کے قیام کا اعلان ہوا جس کی تاسیس کی رسم شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے متبرک ہاتھوں سے ادا ہوئی۔ وہ اپنی ناتوانی کی وجہ سے اپنا خطبہ تاسیس خود نہ پڑھ سکے تو ان کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی نے یہ خطبہ پڑھا جس میں حضرت نے فرمایا تھا "مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثرات سے مطلقاً آزاد۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں اور ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا۔ اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بنائے۔" اور بقول ڈاکٹر ذاکر حسین اس وجود مقدس کی ہڈیاں قید جلاوطنی اور تفکرات ملی نے گھلادی تھیں اور وہ نہ صرف ان نوجوانوں کو خطاب فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے بلکہ ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ انہی برگزیدہ حضرات کی دعاؤں اور تدبیروں کے نتیجہ میں اتنے بلند مقاصد اور پاکیزہ عزائم کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ عمارت چند ہوس کے بنگلوں پر مشتمل تھی اور پڑھائی درختوں کے نیچے ٹاٹ کے فرش پر ہوتی تھی اور جب یہ بھی نہ ہوتا تو اپنے اپنے صافیوں کی طرح بچھالیتے۔ کون سوچ سکتا تھا کہ قوم و ملت کے نام پر قائم ہونے والا یہ مقدس ادارہ جب یونیورسٹی کا روپ اختیار کرے گا تو اس کی امتیازی خصوصیات باقی نہ رہیں گی اور اس کا اقلیتی کردار سلب کر لیا جائے گا اور مسلمانوں کے خون پسینہ محنت مشقت اور مزدوری کے پیسوں سے بننے والی یونیورسٹی میں انھیں کو مراعات داخل نہ ہوں گی۔" [۵۴]

۳۔ شیعہ سنی تنازعہ کے تناظر میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی اپنے جتی آزاد کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

"لکھنؤ ادبی و تہذیبی امتیاز اور دوسری گوناگوں خوبیوں اور خصوصیتوں کے لئے مشہور تھا لیکن اب یہی شہرۂ آفاق شہر شیعہ سنی جھگڑے کے لئے بدنام ہے۔ یہاں ایک عرصہ تک نوابان اودھ کی حکومت رہی جو شیعہ تھے۔ ان ہی کے زمانے میں عزاداری کے جلوس نکلنا شروع ہوئے مگر کبھی

---

[۵۴] شذرات معارف جون ۱۹۹۷ء

شیعہ سنی جھگڑا نہیں ہوا۔ اس کا سلسلہ انگریزوں کے دور میں اس وقت شروع ہوا جب تبرا بازی عزاداری کا جزو اعظم بنا۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریسی حکومت قائم ہوئی اور پنڈت گووند ولبھ پنت نے شیعوں کی شدید مخالفت کے باوجود سنیوں کو مدح صحابہ کا جلوس نکالنے کی اجازت دیدی۔ اس سے تصادم اور ٹکراؤ کی مستقل بنیاد پڑی۔ گذشتہ بیس برسوں سے حکومت نے دونوں فرقوں کے جلوس پر پابندی عائد کردی تھی اس کی وجہ سے فساد اور خون خرابہ نہیں ہو رہا تھا مگر یہ صورت نہ تو ہمارے خاموش نہ رہنے والے جوانوں کو پسند تھی اور نہ ان کے دوست نما دشمنوں کو۔ چنانچہ اس ہجری سال کے آغاز ہی میں پُرجوش شیعی نوجوانوں نے اس پابندی کو مداخلت فی الدین کہہ کر حکومت سے اسے ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور حکومت کے انکار پر احتجاج اور دوسرے ناروا طریقے اختیار کئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے سنجیدہ متین اور ذمہ دار لوگوں کو مسئلہ کی سنگینی اور اس کی نزاکت کو اس کے وسیع تر تناظر میں سمجھ کر دونوں فرقوں میں اتحاد و اتفاق کے نقطے تلاش کرنا چاہئے تاکہ ان کی جو قوت برادر کشی اور اپنے ہی زیاں میں صرف ہو رہی ہے وہ دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے مقابلے میں صرف ہو۔ کیا پورے ملک میں دونوں فرقوں میں چند نفوس بھی ایسے نہیں ہیں جو انھیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی سے باز رکھیں۔ لکھنؤ کی پیچیدہ صورت اور شیعہ سنی کشمکش کو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے رحم و کرم پر چھوڑا نہیں جا سکتا ہے۔ دونوں فرقوں کو خود مل جل کر اس کا حل ڈھونڈنا ہوگا چاہے اس کے لئے ایک دو بار نہیں دسیوں بار مل بیٹھنا پڑے۔ اس وقت ملت کا اتحاد اہم فریضہ ہے اور شیعہ سنی تنازعہ کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا سب سے مبارک اور مقدس کام ہے۔"[46]

مذکورہ بالا موضوع سے متعلق حوصلہ افزا بیان نقل کرتے ہوئے معارف میں آگے چل کر مولانا ضیاء الدین اصلاحی قومی رجحان کو مثبت موقف کی طرف لانے میں صحافتی کردار کو نہایت عمدگی سے نبھاتے ہیں:

"نئی دہلی سے شائع ہونے والے 'سیکولر قیادت' اخبار میں مولانا کلب صادق کا یہ فراخ دلانہ اور صلح پسندانہ بیان شائع ہوا ہے۔ "لکھنؤ کے بعض اہل سنت حضرات کا خیال ہے کہ شیعہ حضرات جلوس ہائے عزا میں تبرا پڑھتے ہیں جب کہ واقعیت اس کے خلاف ہے تاہم اس بحث میں میں نہیں پڑتا۔ میں تمام علمائے شیعہ لکھنؤ کی طرف سے برادران اہل سنت کو یقین دلاتا ہوں کہ جلوس ہائے عزا میں تبرا ہرگز نہ پڑھا جائے گا۔ ہم سب اس بات اور اس عمل کے لئے تیار ہیں جس سے برادران اہل سنت کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ ان جلوس ہائے عزا میں صرف و صرف ماتم حسین و شہدائے کربلا ہی کیا جائے گا۔ امید ہے کہ اس تحریر کے بعد غلط فہمیاں دور

---

[46] شذرات معارف جولائی ۱۹۹۷ء

ہو جائیں گی۔ ویسے ہمارے مجتہدین نے جن کی شیعہ فرقہ تقلید کرتا ہے متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا ہے کہ شیعوں کو ہرگز کسی ایسی بات کو انجام دینے کی اجازت نہیں ہے جس سے صفوف مسلمین میں انتشار پیدا ہو اور وحدت مسلمین متاثر ہو۔ میں نے یہ فتویٰ جلیل القدر علمائے اہل سنت کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔"

اس قول فیصل اور صریح فیصلہ دارانہ بیانات کے بعد سنی حضرات کو جلوس ہائے عزا پر معترض نہیں ہونا چاہئے اور نہ مدح صحابہ کے لئے انھیں اصرار کرنا چاہئے کیونکہ ان کے نقطۂ نظر سے دونوں جلوسوں کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ مولانا کلب صادق پر سنی حضرات بھی متفق ہیں۔ وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر اور کئی ملی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔"[۴۳]

۴۔ مسلمانوں کے داخلی محاذ پر مختلف اختلافات، عدم اتحاد اور جماعتی منافرت کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا ضیاء الدین اصلاحی قوم کو نہایت حکیمانہ مشورہ دیتے ہیں:

"دنیا کی کسی قوم و جماعت میں خواہ کیسا ہی شدید اختلاف کیوں نہ ہو لیکن جب اس پر سخت اور نازک وقت آتا ہے تو وہ اپنے باہمی اختلافات کو بھول جاتی ہے۔ اس کے تمام افراد مل جل کر دوسری قوموں اور جماعتوں کی طرف سے ہونے والے حملوں اور خطروں کا سدباب کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اور دوسروں کے ظلم و تعدی کو روکنے کے لئے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ اغیار کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو ناکام بنانے کے لئے برابر فکرمند رہتے ہیں لیکن جس قوم کا زوال و ادبار حد انتہا کو پہونچ جاتا ہے وہ نازک موقع پر بھی ہوش مندی اور تدبیر سے کام نہیں لیتی اور سخت وقتوں میں بھی اپنے ہی جھگڑوں اور بکھیڑوں میں الجھی رہتی ہے۔ مسلمان بھی اسی صف میں شامل ہیں۔ وہ مسلسل مصیبتوں اور خطروں میں گھرے ہوئے ہیں اور ہر طرف سے ان پر یلغار ہو رہی ہے مگر اس کے باوجود وہ متحد و متفق ہونا جانتے ہی نہیں، نہ باہمی اختلافات کو بھول رہے ہیں نہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کی تگ و دو کر رہے ہیں

؎ نہ جانے کون ادا میں ہے دل دیوانہ برسوں سے

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسلمانوں پر عجب وقت آپڑا ہے۔ اقوام عالم انھیں بیخ و بن سے نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں لیکن وہ اپنے کانوں میں تیل ڈال کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے مخالفین ان کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں

---

۴۳ شذرات معارف اگست ۱۹۹۷ء

مگر ان کو اس کی کوئی فکر نہیں ۔ بیرونی چالوں اور خطروں سے وہ بالکل بے پرواہ ہیں ۔ کہیں سے ان کے مقابلے کے لئے کوئی حرکت اور بیداری نہیں ہورہی ہے ۔ اس بے حسی کے ساتھ یہ سنگینی بھی دیکھئے کہ وہ اپنے ہی بھائیوں کے خون کے پیاسے ہیں ۔ جو اختلافات فرسودہ ہوچکے ہیں یا موت سے دب چکے تھے ان کو از سر نو زندہ کررہے ہیں ۔ خانہ جنگی ، خونریزی ، باہمی عداوت و مخاصمت ان کا وتیرہ بن گئی ہے ۔ ایک دوسرے کی تحقیر و رسوائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ نفرت ، کدورت اور بغض و حسد کی آگ ہر دل میں بھڑک رہی ہے ۔ غرض ساری صلاحیت قوت اور دولت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں صرف ہورہی ہے ۔ آخر اس کا انجام کیا ہوگا ؟ دشمن سے غفلت و بے پروائی اور باہم ایسی سخت آویزش و کشمکش کا نتیجہ کیا نکلے گا ؟

اس سے اتفاق ہے کہ احقاق حق اور ابطال باطل ضروری ہے لیکن کیا اس کے لئے قتال و خونریزی اور شر انگیزی بھی ضروری ہے ؟ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے بعض فرقوں کے عقائد و اعمال بہت بگڑ چکے ہیں بلکہ ان کے حدود کفر و شرک سے جا ملے اور توحید خالص سے بالکل مخالف سمت میں ہوگئے ہیں ۔ ان کی اصلاح و ہدایت کے لئے وعظ و تذکیر لابد ہے وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ لیکن دعاۃ و مبلغین کا بڑا طبقہ خود ہی ناپختہ اور محتاج اصلاح ہے ۔ وہ اسلام کے اصول دعوت حکمت ، موعظت ، بطریق احسن جدال اور بشروا و لا تنفروا کی روح سے ناآشنا ہے ۔ اسی لئے اس کی دعوت و تبلیغ حق و صداقت سے برگشتہ کردیتی ہے ۔ غلط موقف پر لوگوں کے اصرار میں مزید شدت پیدا کردیتی ہے ۔ مونھ میں ایسی نفرت اور عصبیت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ باطل عقیدہ و خیال سے دست بردار ہونے کے بجائے حق سے اور زیادہ منحرف اور بعید تر ہوجاتا ہے ۔ تبلیغی جماعت کے طریقۂ اصلاح و دعوت سے توڑنے کے بجائے جوڑنے اور فصل کے بجائے وصل کے امکانات پیدا ہوسکتے ہیں ۔ دعوت و تبلیغ کا ایک میدان غیر مسلم بھی ہیں مگر ادھر ان کی جانب توجہ کیوں نہیں ہے ؟ اسلام اور مسلمانوں سے غیر مسلموں کی نفرت و بدگمانی دور کرنے کے لئے یہ ایک ضروری کام ہے ورنہ غیر مسلم خود مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کرلیں گے ۔ " [48]

---

48 شذرات معارف اکتوبر ۱۹۹۷ء

۳- وفیات اصلاحی کا جائزہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا انتقال ۱۸ر نومبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ کے ایک سڑک حادثہ کے دوران ہوا ۔ نومبر ۱۹۸۷ء کے شذرات معارف وہ بذات خود لکھ کر گئے تھے بلکہ پورا معارف چیک کرکے اور مکمل طور پر اپنی نگرانی میں مرتب کرکے گئے تھے اور وہ طباعت کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا ۔ چنانچہ اس حادثہ کی خبر پاکر ادارہ نے فوری طور پر ایک تعزیتی نوٹ کا اضافہ ۱۹۸۷ء کے معارف کے اوائل اوراق میں کردیا جبکہ مولانا ضیاءالدین اصلاحی نے دسمبر ۱۹۸۷ء کا پورا شمارہ از اول تا آخر سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے سوگ نامے کے طور پر ترتیب دیا جس کو ان کے دور انتظام میں وفیات کے باب میں اولیت حاصل ہے ۔

مولانا ضیاءالدین اصلاحی دارالمصنفین کے ناظم اعلیٰ اور معارف کے مدیر کی حیثیت سے دسمبر ۱۹۸۷ء سے جون ۱۹۹۹ء تک مکمل ۱۱½ برس پورے کرچکے ہیں ۔ اور الحمدللہ ابھی پورے صحت و شادمانی اور ایمان و اعمال کی سرگرمی کے ساتھ اور قومی و ملی خدمت کے جذبہ سے سرشار زندگی کے آگے کے سفر کی جادہ پیمائی جاری ہے ۔

مذکورہ ساڑھے گیارہ سال کی طویل مدت میں معارف کے 138 شماروں کے سرورق پر بحیثیت مرتب ان کا نام ثبت ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ایک کہنہ مشق مدیر اور تجربہ کار ادیب کی حیثیت سے ان کا نام اردو زبان و ادب اور صحافت کی دنیا میں لیا جاسکتا ہے ۔ انھوں نے دارالمصنفین کی رفاقت کا ایک طویل عرصہ گزارا ہے اور نظر شناس اساتذہ اور ماہرین فن کی صحبتوں سے فیض اٹھایا ہے ۔ چونکہ وہ ایک جہاں دیدہ ادیب ہیں ان کے پاس تجربات و مشاہدات کی زنبیل ہے اور وہ سارے ایسے حادثے ان کی آنکھوں میں مقید ہیں جو ان ادوار میں پیش آئے ہونگے ۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک ایسے نازک تاریخی دور اور پُرآشوب زمانہ کے ایسے نگار ہیں جب ہر طرف ہر پہلو سے ہر سطح پر قحط الرجال بڑھتا جارہا ہے اور بقول شخصے یہ بات ثابت ہورہی ہے کہ

؎ جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں + کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی (اقبال)

اس کے ساتھ ادوار کا پورا سماجی سیاسی اور ثقافتی منظرنامہ ان کے ذہن و افکار کے کیمرے میں مقید ہوگا ۔ GENERATION GAP کی وجہ سے ان کے مدیرانہ افکار سے اختلاف ممکن ہے لیکن چونکہ محسوسات کی دنیا ایک ہے اور چونکہ علمی و ادبی اقدار بھی مشترک ہیں اس لئے ان تجربات میں بھی یکسانیت ہے جن سے سابقہ مدیران معارف گزر چکے ہیں ۔

مندرجہ ذیل سطور میں ان چند اہم سوگ ناموں کی فہرست پیش کی گئی ہے جن کا تعلق مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے دور نظامت وادارت سے ہے :

علماء و مشائخ : ——

مولانا سید علی نقی نقوی	ممتاز شیعہ عالم اور سابق صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	جون ۱۹۸۸ء
مولانا انعام الحسن کاندھلوی	امیر جماعت تبلیغی	جولائی ۱۹۹۵ء
قاضی اطہر مبارک پوری	ممتاز عالم دین	اگست ۱۹۹۶ء
مولانا منظور نعمانی	"	جون ۱۹۹۷ء
قاری سید صدیق احمد باندوی	"	اکتوبر ۱۹۹۷ء
مولانا امین احسن اصلاحی	"	جنوری ۱۹۹۸ء
مولانا صدر الدین اصلاحی	" جماعت اسلامی پاکستان کے ممتاز رہنما	دسمبر ۱۹۹۸ء
شیخ عبدالعزیز بن باز	مملکت سعودیہ کے جلیل القدر عالم دین، مفتی اعظم	جون ۱۹۹۹ء
مولانا شاہ عبدالحلیم جون پوری	شیخ طریقت اور عالم دین	"

صاحبان زبان و ادب : ——

پروفیسر خلیق احمد نظامی	ممتاز اہل قلم، محقق، دانشور	جنوری ۱۹۹۸ء
پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	ممتاز اہل قلم	ستمبر ۱۹۹۶ء
پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	محقق، نقاد، ادیب، صاحب طرز انشاء پرداز	فروری ۱۹۹۶ء
پروفیسر قیام الدین احمد	محقق، مورخ، نامور علم داں	دسمبر ۱۹۹۸ء
حیات اللہ انصاری	صحافی، ادیب، افسانہ نگار، اردو تحریک کے رہنما	مارچ ۱۹۹۹ء
سید یوسف	RADIANCE کے ایڈیٹر اور جماعت اسلامی ہند کے سکریٹری	اکتوبر ۱۹۹۷ء
پروفیسر محب الحسن	ممتاز مورخ، عالم	جون ۱۹۹۹ء
مجنوں گورکھپوری	ممتاز اہل قلم، شاعر، ادیب	جولائی ۱۹۸۸ء

مشاہیر صوبہ بہار : ——

پروفیسر سید حسن	پٹنہ یونیورسٹی	ممتاز محقق و دانشور	دسمبر ۱۹۸۸ء
مولانا شاہ عون احمد قادری	خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کی ممتاز شخصیت، عالم دین، پیر طریقت		مئی ۱۹۹۸ء
مولانا عبدالرحمٰن	امیر شریعت (خامس) بہار و اڑیسہ		نومبر ″

مشاہیر عالم اور مشاہیر پاکستان : ——

جنرل محمد ضیاء الحق	صدر پاکستان	ستمبر ۱۹۸۸ء
حکیم محمد سعید	متولی ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان	نومبر ۱۹۹۸ء

ہندو صاحبان دانش : ——

رام لعل نابھوی	ممتاز اہل قلم	اپریل ۱۹۹۶ء
پنڈت آنند نرائن ملا	″	جولائی ۱۹۹۷ء

وابستگان دارالمصنفین : ——

سید صباح الدین عبدالرحمٰن	ناظم اعلیٰ دارالمصنفین و مدیر معارف	دسمبر ۱۹۸۷ء
سید شہاب الدین دسنوی		مئی ۱۹۹۸ء

۴- وفیاتِ اصلاحی کے چند اقتباسات

ا- آہ ! جنرل محمد ضیاء الحق !- شذرات معارف ستمبر ۱۹۸۸ء

پاکستان کے اس وقت کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے ایک ہوائی حادثہ میں جاں بحق ہو جانے پر شدید رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی ذاتی اور نجی زندگی پر یوں تبصرہ کرتے ہیں :

" ان کی دینداری اور عقیدہ و عمل کی پختگی کا مظاہرہ ان کی ذاتی اور نجی زندگی سے لیکر قومی و بین الاقوامی ہر سطح پر ہوتا رہتا تھا - وہ جس درجہ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اسی درجہ ان کی زندگی اور سیرت پاکیزہ تھی - وہ دن میں امور سلطنت کی گتھیاں سلجھاتے اور رات کا آخری پہر تسبیح و تہلیل، دعا، مناجات اور توبہ و استغفار میں گزارتے اور رمضان المبارک کے آخری ایام حرمین شریفین کے لئے وقف رکھتے ؎

تجھ سے ہو آشکار بندۂ مومن کا راز + اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز "

جنرل ضیاء الحق کے مذہبی رجحانات اور عظیم کارناموں کی جھلک یوں پیش کرتے ہیں :

" جب پاکستان کی زمام کار ان کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے اسے ان خطوط پر چلانے کا مصمم ارادہ کر لیا جس کے لئے یہ وجود میں آیا تھا - ہر قسم کی دشواریوں کے باوجود اسلام کا بول بالا اور احکام شریعت کا نفاذ ان کی جدوجہد کا خاص محور رہا - شریعت کی بالا دستی قائم کرنے اور اسلامی طرز حیات کو رائج کرنے کے لئے انھوں نے مختلف آرڈیننس جاری کئے - اپنے ان جلیل مقاصد اور عظیم عزائم کی بنا پر وہ ان تمام لوگوں کی امیدوں کا مرکز بن گئے تھے جو دنیا کی پریشانی اور انسانیت کے دکھوں کا مداوا اسلام ہی کو خیال کرتے ہیں - مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک بار ان کے متعلق فرمایا تھا ع ترکش مارا خدنگ آخریں - پاکستان کے گذشتہ اور موجودہ ارباب سیاست اور حکمرانوں میں وہ اس حیثیت سے

علانیہ ممتاز تھے کہ اسلام کا نام لینے میں ان کو کبھی کوئی گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ بیان دیتے، مجمع میں ہوتے ہر جگہ اسلام کا گن گاتے اور اپنی تقریروں میں اس کی عظمت و برتری کو واضح کرتے۔ اس میں کسی سیاسی مصلحت کو دخل نہ ہوتا بلکہ یہی ان کے دل کی آرزو ہوتی تھی۔ وہ بین الاقوامی اجتماعات میں بھی اسلام کی صداقت وحقانیت کا اعلان کرنے سے باز نہیں رہتے تھے۔ ۱۹۸۰ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کی مناسبت سے ان کی جو تقریر ہوئی اس میں دنیا کے اکثر ملکوں کے سربراہ موجود تھے۔ اس میں آنحضرت ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کے حوالہ سے بتایا کہ اسلام ہی ساری دنیا کے لئے خیر و برکت کا ضامن ہے، وہ رنگ و نسل کی تفریق مٹا کر وحدت، اخوت اور محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس سے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے درپیش مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

انھوں نے پاکستان کو فلاحی ریاست بنانے کے لئے عدل و مساوات کو فروغ دیا اور ملک میں پھیلی ہوئی بے راہ روی اور بدعنوانی کو دور کرنے کی طرف پوری توجہ کی۔ انھوں نے فوجی و اقتصادی حیثیت سے پاکستان کو مضبوط و مستحکم کرکے اور دنیا میں اس کا وقار بلند کرکے عوام کا دل جیت لیا تھا۔ ان کے طویل دور حکومت میں نہ کوئی بڑا ہنگامہ و انتشار رونما ہوا اور نہ کوئی فتنہ سر اٹھا سکا۔ جو مسائل پیدا ہوئے ان کے تدبر اور ہوشمندی سے حل ہوگئے۔ وہ اپنی سوجھ بوجھ، دور اندیشی اور فراست سے نازک مراحل طے کرلیتے تھے اور پاکستان کو بحران سے بچانے میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ حکومت کی خوبی کا معیار جمہوریت ہی تو نہیں ہے جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔

وہ ایک شریف النفس انسان تھے۔ ان میں فخر و تمرد کا شائبہ نہ تھا۔ وہ اپنی تواضع، انکسار اور خوش خلقی سے اپنے مخالفین کا دل بھی موہ لیتے تھے اور ان کی مخالفانہ سرگرمیوں کو بھی ضبط و تحمل سے انگیز کرتے تھے۔ ان کی زندگی صاف ستھری اور بے داغ تھی۔ ان پر بدعنوانی، کنبہ پروری اور اپنے عہدہ کے بیجا استعمال کا الزام نہیں لگا۔ وہ سادہ زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ صدر ہونے کے بعد بھی اس عالیشان قصر صدارت میں منتقل نہیں ہوئے جو ان سے پہلے ایک کروڑ کی لاگت سے تعمیر کرایا گیا تھا" [49]

---

[49] شذرات معارف ستمبر ۱۹۸۸ء

۲۔ پنڈت آنند نرائن ملا — وفیات معارف جولائی ۱۹۹۷ء

اردو زبان کے اس عظیم قدردان کی موت پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں :

" ان کی اصل شہرت و امتیاز کا باعث یہ ہے کہ وہ اردو کے ایک بڑے شاعر، نقاد، ادیب، سیکولر، انسان دوست اور گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ تھے۔ اردو کی محبت ان کے رگ و پے میں رچی بسی ہوئی تھی اور وہ اس کے اپنی مادری زبان ہونے پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ " میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن مادری زبان نہیں چھوڑ سکتا۔" ان کا شعر ہے : آ مجھ کو گلے لگالے میری اردو + اک آخری ایسے گالیں تو ہمیں

منظوم تصنیفات کے علاوہ بعض نثری تصنیفات بھی یادگار ہیں۔ نظم و غزل دونوں پر قدرت تھی۔ روایت کی پاسداری کے باوجود کلام میں فرسودگی نہیں۔ مشاعرہ کے شاعر نہ تھے مگر اس میں شرکت کرتے تھے۔ دارالمصنفین کی سلور جوبلی کے مشاعرہ کی صدارت کی تھی۔ اب غیر مسلموں میں اردو کے ایسے عالم، دانشور اور اس سے گہرا لگاؤ رکھنے والے عنقا ہو رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی وفات اردو کا واقعی ناقابل تلافی نقصان ہے۔" [1]

۳۔ مولانا امین احسن اصلاحی — وفیات معارف جنوری ۱۹۹۸ء

مولانا امین احسن اصلاحی کے انتقال پر ملال پر اپنے دلی جذبات کا اظہار مولانا ضیاء الدین اصلاحی بہت خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں :

" ادھر سال بھر سے اس بات کا کھٹکا لگا ہوا تھا کہ علم و کمال کا یہ مہر جہاں تاب غروب ہونے والا ہے اور قرآن و حدیث کے بحر کا شناور اور غواص، علامہ حمید الدین فراہی کا جانشین و ترجمان، ان کے علوم و معارف کا وارث و امین،

---

[1] وفیات معارف جولائی ۱۹۹۷ء

حکمت قرآنی کا شارح، دین حق کا داعی و مبلغ، اسرار دین کا عارف و آشنا، شرک و توحید اور تقویٰ و نماز کا رمز و حقیقت شناس اپنے ہزاروں شاگردوں اور قدردانوں کو مغموم، اداس اور سوگوار چھوڑ کر جلد ہی سفر آخرت پر روانہ ہونے والا ہے۔" [51]

۴۔ آہ! سید شہاب الدین دسنوی — شذرات معارف مئی ۱۹۹۸ء

دارالمصنفین کے انتظامی امور کے افسر اعلیٰ سید شہاب الدین دسنوی کی موت پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی ان کے ذاتی اوصاف کی جھلکیاں یوں پیش کرتے ہیں:

"وہ ایک باغ و بہار اور مرنجان مرنج شخص تھے۔ شکل و صورت بڑی پاکیزہ تھی۔ گفتگو بہت میٹھے نرم اور دھیمے لہجے میں کرتے اور اس میں بڑی تاثیر اور جاذبیت ہوتی۔ تحریر و تقریر دونوں میں اپنا مدعا بڑی خوبصورتی اور سلیقہ سے پیش کرتے۔ جلسوں اور میٹنگوں میں اپنے خیالات نپے تلے انداز میں مناسب طور سے رکھتے۔ انہیں دوسروں کو متاثر کرنے اور اپنی باتیں منوالینے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ وہ بااصول آدمی تھے، اس معاملہ میں رو رعایت نہ کرتے تھے اس لئے وجہ کہ بعض لوگوں کو ان سے شکایت رہتی تھی۔ ان کی نشست و برخاست ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ رہتی تھی۔ مذہبی لوگوں کی طرح ادیبوں، شاعروں اور ترقی پسندوں سے بھی گھلے ملے رہتے تھے چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں ——

شہاب صاحب آدمی بڑے کارگزار ہیں اور ہر طبقہ میں صاحب رسوخ۔ ادھر آرٹ نوازوں میں شامل، ادھر ہم دقیانوسی لوگوں سے واصل۔ باما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد کو اپنا دستور العمل بنالیا۔ بعض خشک اور متقشف لوگوں کو ان کی یہ رعنائی خیال پسند نہیں تھی اور وہ ان پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ بڑا ضبط و تحمل بھی تھا۔ اپنے اوپر تنقید کو برداشت کرتے، کوئی سخت سست کہتا تب بھی مشتعل اور غضبناک نہ ہوتے۔" [52]

---

[51] وفیات معارف جنوری ۱۹۹۸ء [52] شذرات معارف مئی ۱۹۹۸ء